اسلامی
اور
غیر اسلامی فکر و عمل
عاشق حسین علوی
ایم۔ اے
علمی کتاب خانہ
کبیر سٹریٹ ○ اردو بازار — لاہور

اسلامی

اور

غیر اسلامی فکر و عمل

عاشق حسین علوی

ایم اے

علمی کتاب خانہ

کبیر سٹریٹ ○ اردو بازار — لاہور
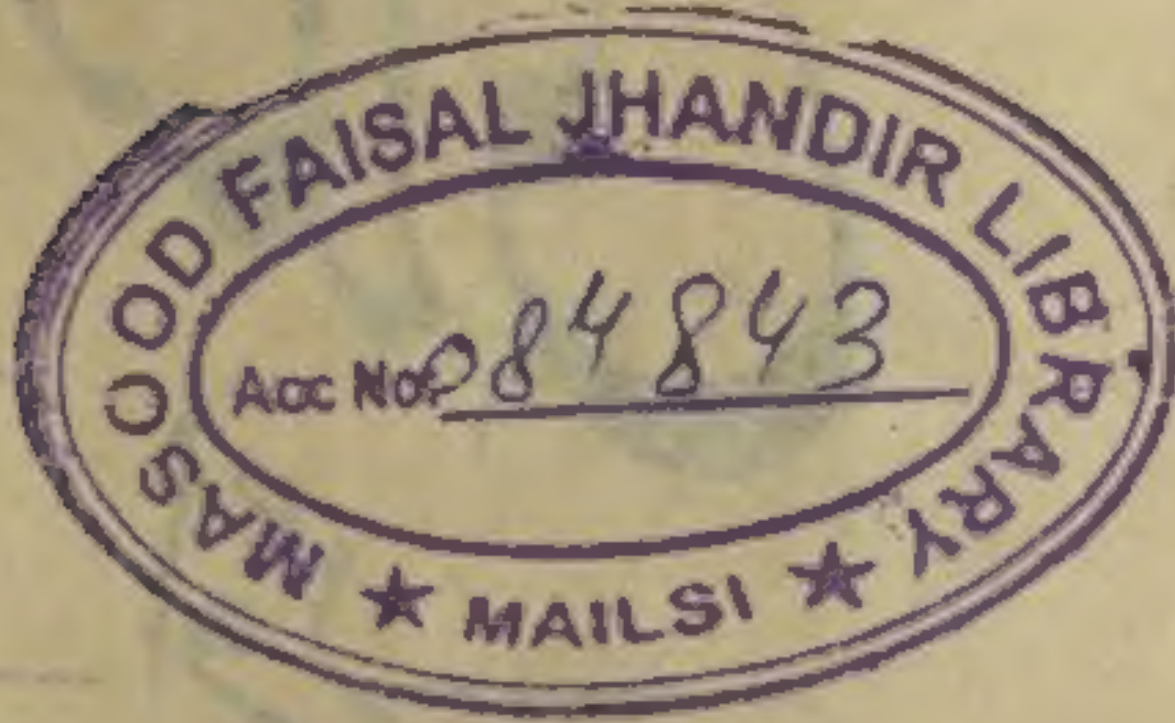
طابع : ـــــــــ علمی کتاب خانہ اُردو بازار لاہور
مطبع : ـــــــــ منظور پرنٹنگ پریس لاہور
مصنف : ـــــــــ عاشق حسین علوی
قیمت : -/

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

جب تک کوئی نظامِ فکر بیرونی اثرات و خیالات کی آمیزش سے پاک رہتا ہے اُس کے افراد میں یک جہتی قائم رہتی ہے۔ یہ بات یوں تو ہر تہذیب کے متعلق بہت حد تک درست ہے لیکن دینی تہذیب کے متعلق اس کا اطلاق قطعی و حتمی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لادینی تہذیب کُلی طور پر مادی تصور ہے۔ مادی ترقی کے ظہور کے ساتھ معاشرے میں کسی حد تک یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے، جس کو تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ سائنس، ٹکنالوجی اور صنعت کے شعبوں میں ہر پیش رفت تہذیب کے ارتقا کا موجب بنتی ہے، جو ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے ممیز کرتی ہے۔

لادینی تہذیب مادی تصور ہونے کے باعث کسی دائمی صداقت پر یقین نہیں رکھتی۔ اس لئے اس کو تغیر پذیر انسانی خیالات سے اس قدر نقصان نہیں پہنچتا، جس قدر دینی تہذیب کو، جس کی بنیاد دین پر اُستوار ہوتی ہے، جو ایک غیر متبدل حقیقت ہے۔ دین، توحید، رسالت، معاملات کی صداقت اور اخلاق کی طہارت کو دائمی حقائق تسلیم کرتا ہے۔

لادینی تہذیب تمام حقائق کو متغیر اور اضافی قرار دیتی ہے چنانچہ اس میں انسان اور انسانی اقدار کی کوئی اہمیت نہیں۔ لادینی تہذیب کو اس سے مطلق کوئی سروکار نہیں کہ زمانۂ قدیم میں اہرامِ مصر یا عصرِ حاضر میں روس کی صنعتی ترقی میں ظالمانہ جبری محنت کا کس قدر حصّہ ہے۔ مادی زندگی کے کل مظاہرات خواہ وہ انسانی گوشت اور خون سے تشکیل پذیر ہوئے ہوں مخصوص لادینی تہذیب کے عناصرِ ترکیبی شمار ہوں گے۔ چونکہ لادینی تہذیب میں حق و باطل کا کوئی تصور نہیں، اس لیے کسی بھی نئے خیال کی آمیزش کو باطل کی آمیزش قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس کے برعکس دینی تہذیب میں حق و باطل کا تصور متعین و واضح ہے جو اس کے متبعین کی عملی زندگی کی صورت گری کرتا ہے۔ چنانچہ دینی تہذیب کے نظام کو دشمنانِ دین کی جاری کردہ لہروں کی یلغار سے محفوظ رکھنا ہر دوسری بات پر فائق ہے۔

فکری لہریں، برقی لہروں کی طرح سریع السیر ہوتی ہیں، یہ مسلسل پھیلتی اور اپنے نقوش چھوڑتی جاتی ہیں۔ ضعیف الاعتقاد اور سریع الاعتبار لوگ نئے خیالات کو قبول کرکے فکری انتشار کا باعث بنتے ہیں۔ یہ اثر پذیری شعوری بھی ہوتی ہے اور لاشعوری بھی۔

نئے خیالات کو بعض لوگ تقلیداً، بعض لوگ فیشن کے طور پر اور بعض ترقی وجدت پسندی کی علامت سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ اکثر فکری لہریں غیر محسوس طور پر اذہان وقلوب میں سرایت کرتی ہیں۔ چور کی آہٹ پیغام بیداری ثابت ہو سکتی ہے، لیکن ان کی نہ کوئی آہٹ نہ آواز۔ صرف قوتِ ایمان ہے۔ جو ان کے خلاف چوکس اور خبردار رکھ سکتی ہے؛ جہاں یہ جنسِ گراں مایہ ناپید ہو، وہاں باطل افکار آن کی آن میں تسلط جما لیتے ہیں جو عسکری تسلط سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

باطل افکار کے پیدا کردہ حوادث وزلازل تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہلاکت آفرینی کی بدولت آج نسلِ انسانی موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہے۔

عصرِ حاضر کے انسان کا مریض ہونا ظاہر ہے۔ اس کی صحت یابی کا انحصار دو باتوں پر ہے؛ تشخیصِ مرض ان فکری لہروں کے انفرادی تشخص کی مقتضی ہے، جن کے ملاپ سے عصرِ حاضر کا نظریاتی نظام تشکیل پاتا ہے، چنانچہ فکری تجزیہ اساسی حیثیت رکھتا ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ کون کون سے افکار ونظریات کس کس انداز واطوار سے انسانی ہلاکت وگمراہی کا سبب بنے ہیں۔

اب رہا علاج کا مسئلہ تو تجزیہ از خود صحیح دوا کی طرف رہنمائی کرے گا۔ یہ دوا درحقیقت انسان کی سرشتِ اوّل کا مطالبہ ہے جو انتہائی گمراہیوں اور باطل پرستیوں کے ہجوم میں بھی برابر قائم رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کبھی مدھم کبھی تیز۔

یہ امر مسلّم ہے کہ انسان کی حدود ہیں، جن سے آگے وہ قدم نہیں مار سکتا۔ نہ تو اُس کی فکر اتنی بسیط ہے کہ محیطِ کل ہو نہ وہ قوتِ پرواز کہ اپنی ذات سے بلند ہو سکے۔ وہ تو پابہ گل ہے اور اپنی خواہشاتِ نفسانیہ کا غلام۔ اس لئے انسان کے فطری تقاضے کی تسکیں کسی انسانی ہدایت و تفلسف سے ممکن نہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں عصرِ حاضر کے نظامِ فکر وعمل کے تناظر میں اُس زندہ جاوید نظامِ حقہ کو انتہائی اجمال کے ساتھ منکسرانہ کوشش کی گئی ہے کہ عصرِ حاضر میں اس سے روگردانی نسلِ انسانی کی ضلالت وگمراہی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

عاشق حسین علوی

تعارفِ کتاب

اسلام نے اُس وقت بنی نوع انسان کو رُشد و ہدایت اور علم و حکمت کی جہاں افروز تجلیوں سے منوّر کیا تھا جب ہر طرف جہالت و ضلالت کے گھُپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ مغرب میں عقل دشمنی اور خرافات نے مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ علمی کتابیں تہہ خانوں میں مقفّل پڑی تھیں۔ صدیوں تک پاپایانِ روم نے اسلام کی روشنی کو ظلمت کدۂ مغرب میں داخل ہونے سے روکے رکھا۔ اس دَور میں عالمِ امکاں کا کوئی گناہ اور کوئی ظلم ایسا نہیں جس سے پاپائیت کا دامن آلودہ نہ ہوا ہو اور جہالت و تیرہ خیالی کی کوئی ایسی صورت نہیں جو ان سے سرزد نہ ہوئی ہو۔ آخر اسلام کی روشن تعلیم سے فیضیاب ہونے کا وقت آپہنچا۔ قرآن مجید لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر پہلی مرتبہ سنہ ۱۵۳۰ء میں بمقام وینس چھپا۔ عیسائی دنیا نے محسوس کیا کہ بندہ کے ساتھ خُدا کا تعلق براہِ راست ہے اور عقل بہت بڑا انسانی جوہر ہے۔ مسلمانوں نے قدماء کے علمی سرمائے کو تباہی سے بچا لیا اور مختلف علمی کتابوں کے تراجم شائع کیئے۔ مارٹن لوتھر نے روما کی غلامی کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا۔ تحریکِ احیائے علوم اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا نے بڑا زور پکڑا اور لوگ مذہب، سیاست اور معیشت ایسے مباحث پر آزادانہ غور و فکر کرنے لگے۔

انیسویں صدی میں حریت پسندی کی تحریک نقطۂ کمال کو پہنچ گئی اور مادہ پرستی کی وہ تحریک جس کا آغاز دیما قریطس اور اپیکورس کے تصوّرات سے ہوا تھا اور قرونِ وسطیٰ میں چرچ کی بالادستی کی وجہ سے رُکی رہی تھی پوری شدّت کے ساتھ دوبارہ شروع ہو گئی۔ اصلاحِ کلیسا اور حریت پسندی کی تحریکوں نے پرانی قدروں کو پامال کر کے بے قید آزادی کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔ حریت پسندی کوئی تعمیری نظریہ تو تھا نہیں جو اس خلا کو مثبت طور پر پُر کر دیتا جو کلیسائی نظام کی شکست و ریخت سے پیدا ہو گیا تھا۔ یہ حالات اشتراکیت کے فروغ کے لیے نہایت سازگار تھے۔ پاپائی نظام کی جبریت نے لوگوں کو مذہب سے متنفر کر دیا تھا۔ مادیّت اپنے قدم جما چکی تھی۔ صنعتی انقلاب نے طبقاتی کش مکش کا بیج بو دیا تھا۔ غرناطہ کی تباہی کے بعد مسلمان ہر جگہ سے نکال دیئے

گئے تھے۔ ان کی عظمت و اقبال کا چراغ بجھ گیا تھا۔ غلامی و محکومی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ ایمان و وجدان کی دولت لٹ چکی تھی اور اسلامی دنیا کے اُفق پر اندھیرے ہی اندھیرے چھا گئے تھے۔ ایسے عالم میں مسلمانوں کی ذہنی مرعوبیت اور انجذابِ گدایانہ کا کیا ٹھکانہ تھا۔ پہلے وہ مغرب کی مادی تہذیب پر فریفتہ ہوئے اور پھر جب مشرق کے اُفق پر اشتراکیت کی سُرخی نمودار ہوئی تو اس کے پرستار بن گئے۔

اشتراکیت مغربی سرمایہ داری اور لادینیت کی شدید ترین شکل ہے۔ اشتراکیت مجسم مادیت ہے اور نفس مذہب کے خلاف جنگ کرنا ناگزیر قرار دیتی ہے۔ فرقِ درجات کے ساتھ دونوں کا مقصد بندگانِ خدا کا استحصال اور اُن کی تذلیل ہے۔ سرمایہ داری نظام میں استحصال کرنے والے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں، لیکن اشتراکی نظام میں سیاسی اقتدار اور ذرائع معیشت پر محدودے چند افراد قابض ہوتے ہیں۔ دراصل اشتراکیت ایک ایسے غیر مصالحانہ اور انتہا پسندانہ اندازِ فکر و عمل کا نام ہے جو کسی قسم کی مخالفت یا انحراف کا روادار نہیں۔ مکمل حاکمیت، مکمل سیاسی استبداد، مکمل اقتصادی اجارہ داری اس نظام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ کسی کو خود یہ نہ معلوم ہو کہ اُس کے پاس کیا ہے۔ اسلام دین اللہ ہونے کے باعث زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے اور شخصی اور گروہی رغائب و تعصبات سے پاک ہے۔ اس کا معاشی معاشرتی اور سیاسی نظام دوستی اور عدل پسندی کا عدیم النظیر شاہکار ہے۔ یہ اللہ کی وحدانیت، وحدتِ انسانیت، احترامِ انسانیت، عالمگیر اخوت اور انسانی مساوات کا مذہب ہے۔ سر ہملٹن گب اور ٹائن بی ایسے مشاہیر کی رائے ہے کہ اسلام نے قائم اور دائم ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اسلامی رواداری عالمی اخوت، نسل و رنگ کے تصورات کی بیخ کنی اور توحید پرستی ایسی خوبیاں ہیں جو مغربی معاشرہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اسی اجمال کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اس میں انسانی فکر و عمل کے تناظر میں دین اسلام کی چند جھلکیاں پیش کرنے کی منکسرانہ کوشش عمل میں لائی گئی ہے۔ تاکہ حق و باطل کا فرق ظاہر ہو اور ظلمت پوش قلوب نورِ ایمان کی جلوہ فرمائیوں سے چمک اُٹھیں۔

عاشق حسین علوی

ترتیب

باب ا

علم التاریخ

اہمیت و وسعت

تاریخ ایک مسلمہ قوت ہے۔ یہ نورِ بصیرت بھی ہے اور تحریکِ عمل بھی، یہ چراغِ راہ بھی ہے اور راہِ سفر میں خطر و مخافت کا نشان بھی، یہ ماضی کا ترکہ، حال کا اثاثہ اور مستقبل کے لئے درس و حکمت کا صحیفہ ہے۔ اس کے حیرت خانہ میں تہذیب و تمدن کے نظام ہائے مختلف کی بڑی دل کش، دل سوز اور فکر انگیز تصویریں ملتی ہیں۔ انسانی فکر و دانش کے تعمیر کردہ محل، سعی و عمل کے بپا کردہ ایوان، عظمت و جبروت کے تیار کردہ قصر دیدۂ عبرت نگاہ کے لیے حکمت و ہدایت کا لازوال خزانہ ہیں۔

تاریخ کا دائرہ شاہی دربار کی ضو پاشیوں، اربابِ اختیار کی عیش پرستیوں اور میدانِ کارزار کی ہلاکت آفرینیوں تک محدود نہیں۔ یہ پوری انسانی زندگی پر محیط ہے اور اس طرح محیط ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں، جو اس میں نہ جھلکتا ہو۔ انسانی فطرت کی بلندی و پستی، عقل و فکر کی رسائی، تخلیق و ایجاد کی قوت، اختراع و اکتشاف کی استعداد، مختصر یہ کہ تاریخ، انسان کے خوب و زشت کی ایک مکمل داستان ہے۔

تاریخِ عالم کا مطالعہ مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کیا گیا ہے۔ بعض مفکرین نے انسانی زندگی کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے معاشرتی ڈھانچے کی ابتدائی صورتوں سے لے کر ترقی یافتہ نظامِ معاشرت کے مختلف مدارج کی نشاندہی کی ہے۔ بعض نے قوتوں کے عروج و زوال کی داستان بیان کی ہے۔ بعض نے تاریخ کی روشنی سے فکر و نظر کے چراغ جلائے ہیں اور سلطنتوں کے قیام و بقا کے گُر سکھائے ہیں۔ بعض نے تاریخی واقعات و انقلابات کی بڑی دلچسپ توجیہات پیش کی ہیں اور اُن کی اساس پر نئے فکری نظام کی عمارت

قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ نے انسان کو انسان کا مجبور و مقہور غلام بھی دیکھا ہے۔ فراعنہ کا استبداد اور ان کی سرکشی بھی دیکھی ہے، جابر فرمانرواؤں کے جور و ستم بھی دیکھے ہیں۔ حرب و ضرب اور قتال و جدال کی خونچکانیاں بھی دیکھی ہیں۔ یونان و ایران اور مصر و روما ایسی عظیم الشان تہذیبوں کو ابھرتے، پروان چڑھتے اور مٹتے بھی دیکھا ہے۔ جمہوریت اور انسانی آزادی کے نام پر غلامی و محکومی کے پنجۂ آہنی کی گرفت بھی دیکھی ہے۔ مغرب کی بالادستی اور استعمار پسندی کے انسانیت کش مناظر بھی دیکھے ہیں۔ آمرانِ عاقبت نا اندیش کی چیرہ دستیوں، عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں اور آتش فشانیوں کو بھی دیکھا ہے۔

یہی کچھ نہیں، تاریخ نے تفلسف و حکمت کی موشگافیاں بھی دیکھی ہیں اور افکار و نظریات کی گلکاریاں بھی، تاریخ ساز فکری نظام اور ان کے اثرات و مضرات بھی اس کی نگاہ سے گزرے ہیں۔

وحدتِ تاریخ

تاریخ پر کسی ایک قوم یا ملک کی اجارہ داری نہیں، ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ پوری انسانیت کی ملکیت ہے۔ وحدتِ تاریخ اصل چیز ہے۔ اسے پیشِ نظر رکھ کر ہی روحِ تاریخ تک رسائی ممکن ہے، چنانچہ تاریخ کے یک رخی، جزوی یا یک جہتی مطالعہ سے صحیح نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ بے میل و رغبت پوری انسانی تاریخ کے مطالعہ سے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جن کی روشنی میں انسان اپنے لیے صحیح راستہ اور منزل متعین کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

عصرِ حاضر کی تحصیلات

انسانی ترقی کا ہر قدم اور ہر دور یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ ابتدائی دور میں چقماق کی دریافت یا خوراک پیدا کرنے کے طریقوں کا علم آج کی خلائی پرواز یا چاند کی سیر سے کم اہم نہیں۔ ظاہر ہے کہ آج کے انسان کے پاس ماضی کے علم و فکر، تجربات و مشاہدات اور ایجادات و اکتشافات کی بے پایاں دولت ہے، جس سے ابتدائی دور کا انسان محروم تھا، بہرکیف عصرِ حاضر انسانی تحصیلات و کمالات کا انتہائی نقطۂ عروج متصور ہوتا ہے۔

آج زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، فاصلے سمٹ گئے ہیں، سفر میں حضر کے مزے ہیں۔

برق رفتار طیارے حاضر ہیں۔ گھنٹوں میں دنیا کی سیر کر لو۔ گھر بیٹھے جس سے چاہو، جب چاہو
لطفِ ہمکلامی حاصل کر لو۔ ہجر و مفارقت کہاں اب تو وصل ہی وصل ہے، بُعد کا غم کہاں اب تو قُرب
ہی قرب ہے۔ ٹیلیویژن کے توسّل سے سب کو دیکھو، سب سے ملو، سب کی سنو، سب کو سناؤ،
اب سہولتیں ہی سہولتیں اور آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔ جب چاہو کمرہ گرم، جب چاہو سرد، نہ
سردی کی شدت نہ گرمی کی تکلیف۔ آج کی شامیں روشنی کے لیے ماہتاب کی جلوہ فرمائیوں کی
منتظر نہیں۔ قمقموں کی روشنی سے کونہ کونہ بقعۂ نور ہے، زندگی پورے جوش سے رواں دواں ہے
ہر طرف گہما گہمی اور ہما ہمی ہے۔ ہر طرف چہل پہل اور شور و غل ہے۔ ہر طرف سرخوشی و سرمستی کا عالم
ہے۔ ہر کوئی دوڑا جاتا ہے بے تحاشا و بے محابا۔

انسان کی فریب خوردگی

اس میں شک نہیں کہ مادی فطرت کی تمام قوتیں انسان کے سامنے سرنگوں ہیں۔ پہاڑ
ہوں کہ سمندر، فضا ہو کہ خلا، سب پر اس کی حکمرانی اور فرماں روائی کا سکہ جاری ہے لیکن اس کا
قلب ویراں، روح منغّص اور ذہن ماؤف ہے۔ سطحِ حیات پر آب و تاب ہے، چمک دمک ہے،
تسخیر و تعمیر کا غلغلہ ہے لیکن اندرونِ حیات مایوسیاں ہیں محرومیاں ہیں اور تاریکیاں ہیں ؎

کہاں سے بڑھ کے پہنچا ہے کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی

سطحی لذتیت اس کا مقدر بن چکی ہے اور انبساطِ حقیقی اس سے روٹھ چکی ہے۔ لذت و
مسرت کا امتیاز تو مذاقِ سلیم کی بات ہے، حالت تو یہ ہے کہ علالت کو صحت، فریب کو
حقیقت اور ضلالت کو اصلیت سمجھ لیا گیا ہے۔ حیات جسم تک اور علم حواسِ ظاہری کے
مشاہدے اور تجربے تک محدود ہے۔ جہاں اخلاقی قدریں قصۂ پارینہ بن چکی ہوں اور ہوا و ہوس
پر کوئی قدغن نہ ہو، وہاں نہ طمانیتِ قلب ہے اور نہ احترامِ آدمیت ؎

یہ روشنی کا زمانہ، یہ ظلمتوں کا عروج
اس انجمن کے خداؤ، بڑا اندھیرا ہے

تاریخ اور بُت پرستی

حقیقت یہ ہے کہ مادی فطرت انسان کے حضور اور انسان مادی فطرت کی بارگاہ

میں سجدہ ریز ہے۔ انسان پرانا بت پرست اور بت تراش ہے۔ از منۂ قدیم میں انسان پتھروں جانوروں اور مظاہرِ قدرت کی پرستش کرتا تھا۔ یہ دَور انسانی فکر و شعور کا عہدِ طفولیت تھا، لہٰذا اس دَور کے انسان کی مظاہر پرستی کو ایک بالاتر قوت کی تلاش میں سرگردانی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

عصرِ حاضر کی بت گری، مادیت پرستی کا نتیجہ ہے۔ عصرِ حاضر نے قومیت، وطنیت اور فوق البشر ہستیوں کے بت تراشے ہیں جو بڑے حشر انگیز ہیں۔ وطنیت پرستی نے نسلِ انسانی کو عالمی جنگوں کی آگ میں جھونک دیا اور فوق البشر پرستی نے نپولین، مسولینی، ہٹلر، لینن اور سٹالن ایسے خون آشام ڈکٹیٹروں کو جنم دیا۔

اگر انسان، انسان کے ساتھ انصاف کر سکتا اور خدائی کا بھوت اُس کے سر پر سوار نہ ہوتا تو انسانی تاریخ، موجودہ تاریخ سے بالکل مختلف ہوتی۔

انسانیت موت کے دہانے پر

آج انسانیت موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ٹائن بی جس نے تاریخ و تہذیب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے لکھتا ہے:

"ماضی میں مسلسل جنگوں کی بدولت جن کا انجام تمام بڑی طاقتوں کی شکست اور ایک کی فتح پر ہوتا تھا، عالمگیر ریاستیں وجود میں آتی رہی ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کے ماقبل زمانہ میں بھی جنگ کے ذریعے اس طرح کا تصفیہ اس قدر تباہ کن ہوتا تھا کہ جو تہذیبیں اس خوفناک تجربے سے بچ نکلتی تھیں، اُنہیں بھی مادی اور نفسیاتی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا تھا۔ اس ایٹمی زمانہ میں کوئی طاقت آخری راؤنڈ تک زندہ نہیں رہے گی۔ اس جنگ میں کوئی فاتح نہیں ہوگا، سب مفتوح ہوں گے بلکہ ایٹمی جنگ کا پہلا راؤنڈ ہی نہ صرف جنگ میں شریک تمام طاقتوں، بلکہ تہذیب، نسلِ انسانی اور اس کرۂ ارض پر پوری زندگی کا مکمل صفایا کر دے گا۔ اب اس امر کا امکان نہیں کہ نسلِ انسانی کو حسبِ سابق طاقت کے بل بوتے پر متحد کیا جا سکے۔ کیونکہ آئندہ جنگ میں جو طاقت استعمال ہوگی، وہ ایٹمی ہے اور وہ نسلِ انسانی کو نیست و نابود کر دے گی اور متحد کرنے کے لیے کوئی چیز باقی

نہ رہے گی۔"[1]

یہ صورتِ حال تو بین الاقوامی سطح پر ہے۔ ملکوں کے حالات غراب تر ہیں۔ جمہوری ملکوں میں اخلاقی اقدار کی پامالی ایک المیہ بن چکی ہے۔ گو کہ ان ملکوں میں لوگوں کو کچھ انسانی حقوق بھی حاصل ہیں، لیکن اشتراکی ملکوں میں انسانیت پر جو قیامت برپا ہے، اُس کے بیان سے تاریخ کے صفحات بُری طرح سیاہ ہیں۔

مطالعۂ تاریخ اور ایک بہت بڑی فروگذاشت

افسوس ہے کہ تاریخ و عمرانیات کا مطالعہ خاص انسانی نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ انسان کے لائے ہوئے مختلف نظام ہائے سیاست و معاشرت نے انسان کو انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے کیا دیا اور جو دیا اُس کا نتیجہ انسان کے حق میں کیا رہا۔ اگر نتیجہ مثبت نہیں تو اصلاحِ حال کی حقیقی صورت کیا ہے۔

ستم تو یہ ہے کہ افکار و نظریات کی بارش ہو رہی ہے۔ ذرکشتِ انسان ویران پڑی ہے۔ فکر و نظر کے چراغ جلائے جا رہے ہیں اور بستیاں اندھیرے میں ڈوبی ہیں۔ ارتقاء و ترقی کے نعرے بلند ہو رہے ہیں اور تنزل عناں گیر ہے۔

---

[1] ٹائن بی۔ تاریخ کا مطالعہ جلد ۱۲ صفحات ۵۱۸، ۵۱۹
A study of History. Vol. XII pp. 518, 519.

باب ۲

فلسفۂ تاریخ

ابنِ خلدون

ابنِ خلدون فلسفۂ تاریخ کا بانی اور امام ہے۔ فلنٹ ابنِ خلدون کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ باقی مفکرین کا تو کیا ذکر افلاطون، ارسطو اور آگسٹائن ایسے شہرۂ آفاق مفکرین بھی ابنِ خلدون کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

ابنِ خلدون مسلّم طور پر پہلا مفکر ہے جس نے تاریخ کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا۔ اُس نے تاریخ کو ایک منضبط علم کی شکل دے کر عمرانیات کی حدود میں داخل کر دیا اور ثابت کیا کہ یہ ایسا سنگھم ہے جہاں تمام علوم کے دھارے ملتے ہیں۔

ابنِ خلدون نے غیر معمولی تدبّر و تفرّس کا ثبوت دیا ہے اور عملِ مؤثرات کا مشاہدہ بڑی دقّتِ نظر سے کیا ہے۔ اُس نے معاشرت، تہذیب، اخلاق، طبعی حالات، مدنیات، فلسفہ، طب، مابعد الطبیعات، الٰہیات، تعلیمات، سحر و طلسمات سب کو مبحث بنایا ہے۔

ابنِ خلدون نے حکومت و سیادت کے اصول وضع کیے، استقرارِ سلطنت کے رموز بتائے، مختلف تہذیبوں کا جائزہ لیا اور ماضی و حال کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ اس نے تاریخ و عمرانیات، اجتماعیات و سیاسیات کو قرآنی تعلیمات کے قالب میں ڈھالنے کی قابلِ تحسین کوشش کی ہے۔ ابنِ خلدون عصبیت کو بقائے سلطنت کے لیے ناگزیر خیال کرتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> "ہم مکرّر لکھ چکے ہیں اور پھر یاد دلاتے ہیں کہ سیاسی تغلب و ملی استحقاق کا مطالبہ و اغیار کی مقاومت عصبیت کے بغیر نہیں ہو سکتی کیونکہ عصبیت ہی ایسی چیز ہے جو کالبدِ قوم میں غیرت و حمیت کی روح پھونکتی اور افرادِ قوم کو باہمی نصرت پر آمادہ کرتی ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے کے لیے

جان دینا معمولی بات سمجھنے لگتا ہے۔"

(مقدمہ تاریخ ابن خلدون جلد دوم صہ، ترجمہ مولوی عبدالرحمٰن)

ابن خلدون دینی عصبیت کو اتحاد بین المسلمین کے لیے ناگزیر خیال کرتا ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ دعوتِ دینیہ عصبیت کو دو چند کر دیتی ہے اور ملت ناقابل تسخیر بن جاتی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ دین، عصبیت والی قوموں کا بغض وحسد مٹا کر ایک ایک فردِ قوم کو حق کے راستے پرلے آتا ہے۔ اس لیے اس حال میں جب وہ اپنے اپنے مقاصد واغراض کو سوچتے ہیں تو سب ایک طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ اُن کا ایک ہی قبلۂ حاجات ہوتا ہے۔ اُسی کی طرف اُن کا قدم بڑھتا ہے اور کسی طرح نہیں رُکتا۔ رہے محض اہلِ سنت، جن کو دین ومذہب کی حمایت سے تعلق نہ ہو۔ اگرچہ مسبوق الذکر جماعت سے دو چند ہی کیوں نہ ہو، چونکہ اُن کی غرضیں باطل وناحق کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے باہم دگر متباین ومتغائر ہوتی ہیں، ایک دوسرے کی نصرت سے جان چراتے ہیں، اس لیئے پہلی جماعت کی مقاومت کی تاب نہیں لاسکتے، کثیر التعداد ہونے کے باوجود اُن کے مقابلہ میں مغلوب اور عشرت پسندی اور آرام طلبی کی وجہ سے جلد ہی تباہ وبرباد ہوجاتے ہیں جیسا کہ ابتدائے اسلام کے زمانہ میں عرب وعجم وروم کی حالت ہوئی۔ کہتے ہیں کہ جنگِ قادسیہ ویرموک کے ہر معرکہ میں مسلمانوں کا شمار تین ہزار سے کچھ ہی متجاوز تھا اور قادسیہ میں سپاہِ فارس ایک لاکھ بیس ہزار سے کم نہ تھی۔ اسی طرح ہرقل کی فوج واقدی کے بیان کے موافق چار لاکھ تھی لیکن ان دونوں سپاہ میں سے کسی ایک کو بھی عرب کے مقابلہ میں جم کر لڑنے کی تاب نہ ہوئی۔ قلیل التعداد عربوں نے انہیں مار بھگایا اور جو کچھ مال ومتاع اُن کے پاس تھا لوٹ لیا۔"

(مقدمہ تاریخ ابن خلدون جلد دوم صفحہ، ترجمہ مولوی عبدالرحمٰن)

ابن خلدون مذہب، اُس کی عظیم روایات اور فکری ورثہ کو دینی عصبیت کا نام دیتا ہے۔ عصبیت اور تعصب کا بیّن فرق ملحوظ رہے۔ تعصب کی بنیاد دوسروں سے نفرت

باب ۲

فلسفہ تاریخ

ابنِ خلدون

ابنِ خلدون فلسفۂ تاریخ کا بانی اور امام ہے۔ فلنٹ ابنِ خلدون کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ باقی مفکرین کا تو کیا ذکر افلاطون، ارسطو اور آگسٹائن ایسے شہرۂ آفاق مفکرین بھی ابنِ خلدون کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

ابنِ خلدون مسلّم طور پر پہلا مفکر ہے جس نے تاریخ کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا۔ اُس نے تاریخ کو ایک منضبط علم کی شکل دے کر عمرانیات کی حدود میں داخل کر دیا اور ثابت کیا کہ یہ ایسا سنگم ہے جہاں تمام علوم کے دھارے ملتے ہیں۔

ابنِ خلدون نے غیر معمولی تدبّر و تفرّس کا ثبوت دیا ہے اور عملِ مؤثرات کا مطالعہ بہ دقتِ نظر سے کیا ہے۔ اُس نے معاشرت، تہذیب، اخلاق، طبعی حالات، مدنیات، فلسفہ، طب، مابعد الطبیعات، الہٰیات، تعلیمات، سحر و طلسمات سب کو مبحث بنایا ہے۔

ابنِ خلدون نے حکومت و سیادت کے اصول وضع کیے، استقرارِ سلطنت کے رموز بتائے، مختلف تہذیبوں کا جائزہ لیا اور ماضی و حال کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ اس نے تاریخ و عمرانیات، اجتماعیات و سیاسیات کو قرآنی تعلیمات کے قالب میں ڈھالنے کی قابلِ تحسین کوشش کی ہے۔ ابنِ خلدون عصبیت کو بقائے سلطنت کے لیے ناگزیر خیال کرتا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

”ہم مکرر لکھ چکے ہیں اور پھر یاد دلاتے ہیں کہ سیاسی تغلّب و ملکی استیلا استحقاق کا مطالبہ و اغیار کی مقاومت عصبیت کے بغیر نہیں ہو سکتی کیونکہ عصبیت ہی ایسی چیز ہے جو کالبدِ قوم میں غیرت و حمیّت کی روح پھونکتی اور افرادِ قوم کو باہمی نصرت پر آمادہ کرتی ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے کے لیے

جان دینا معمولی بات سمجھنے لگتا ہے۔"

(مقدمہ تاریخ ابنِ خلدون جلد دوم صـ۲ ترجمہ مولوی عبدالرحمٰن)

ابنِ خلدون دینی عصبیت کو اتحاد بین المسلمین کے لیے ناگزیر خیال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دعوتِ دینیہ عصبیت کو دو چند کر دیتی ہے اور ملت ناقابل تسخیر بن جاتی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ دین، عصبیت والی قوموں کا بغض و حسد مٹا کر ایک ایک فردِ قوم کو حق کے راستے پر لے آتا ہے۔ اس لیے اس حال میں جب وہ اپنے اپنے مقاصد و اغراض کو سوچتے ہیں تو سب ایک طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ اُن کا ایک ہی قبلۂ حاجات ہوتا ہے۔ اُسی کی طرف ان کا قدم بڑھتا ہے اور کسی طرح نہیں رُکتا۔ رہے محض اہلِ سنت، جن کو دین و مذہب کی حمایت سے تعلق نہ ہو۔ اگرچہ مسبوق الذکر جماعت سے دو چند ہی کیوں نہ ہو، چونکہ اُن کی غرضیں باطل و ناحق کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے باہم دگر متباین و متغائر ہوتی ہیں، ایک دوسرے کی نصرت سے جان چراتے ہیں۔ اس لیے پہلی جماعت کی مقاومت کی تاب نہیں لا سکتے۔ کثیر التعداد ہونے کے باوجود اُن کے مقابلہ میں مغلوب اور عشرت پسندی اور آرام طلبی کی وجہ سے جلد ہی تباہ و برباد ہو جاتے ہیں جیسا کہ ابتدائے اسلام کے زمانہ میں عرب و عجم و روم کی حالت ہوئی۔ کہتے ہیں کہ جنگِ قادسیہ و یرموک کے ہر معرکہ میں مسلمانوں کا شمار تیس ہزار سے کچھ ہی متجاوز تھا اور قادسیہ میں سپاہِ فارس ایک لاکھ بیس ہزار سے کم نہ تھی۔ اسی طرح ہرقل کی فوج واقدی کے بیان کے موافق چار لاکھ تھی لیکن ان دونوں سپاہ میں سے کسی ایک کو بھی عرب کے مقابلہ میں جم کر لڑنے کی تاب نہ ہوئی۔ قلیل التعداد عربوں نے اُنہیں مار بھگایا اور جو کچھ مال و متاع اُن کے پاس تھا لوٹ لیا۔"

(مقدمہ تاریخ ابنِ خلدون جلد دوم صفحہ۔ ترجمہ مولوی عبدالرحمٰن)

ابن خلدون مذہب، اُس کی عظیم روایات اور فکری ورثہ کو دینی عصبیت کا نام دیتا ہے۔ عصبیت اور تعصب کا بیّن فرق ملحوظ رہے۔ تعصب کی بنیاد دوسروں سے نفرت

اور آن کی تحقیر پر ہے اور عصبیت کی اساس ملت کے عظیم ورثہ سے وابستگی پر ہے۔ دینی عصبیت عصبیت رنگ و خون کے بُتوں کو توڑ کر سب افراد کو ملتِ واحدہ میں مدغم کر دیتی ہے۔

ابنِ خلدون نے یہ بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ جب معاشرے کے فکری نظام میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، تو معاشرہ زوال پذیر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں نے دینی عصبیت کی بدولت قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں اُلٹ دیں۔ فتوحات پر فتوحات حاصل کیں۔ اسپین میں صدیوں حکومت کی لیکن جب مسلمان دینی عصبیت کی قوت سے محروم ہو گئے اور نفسا نفسی کا دور شروع ہو گیا تو وہ بہ یک بینی و دو گوش ہر جگہ سے نکالے گئے۔

جب ہوا و ہوس کی آندھیاں چلنے لگیں تو دل بے نور ہو جاتے ہیں اور عظمت و اقبال کے چراغ بجھ جاتے ہیں، ظلمتیں چھا جاتی ہیں اور ذلتیں مقدر بن جاتی ہیں۔

ابن خلدون پہلا مفکر ہے جس نے تاریخی استدلال سے ثابت کیا کہ جن قوموں میں روحانی اخلاقی اور تہذیبی ابتری پیدا ہو جاتی ہے، اُن کا زوال یقینی ہو جاتا ہے۔

ابن خلدون تاریخی حالات و واقعات کو انسانی شعور اور ارادے کی صورت گری بتاتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسان واقعات کے ریلے میں بے دست و پا نہیں بلکہ فعال و کارساز ہے اور تخلیقی قوتوں کا مالک ہے۔ ابنِ خلدون کے خیال کے مطابق انسان میں قوتِ ممیزہ ہے اور وہ نیک و بد میں تمیز کرنے پر قادر ہے۔

زینو

زینو رواقیت کا بانی تھا۔ وہ اور اُس کے متبعین اس عقیدے کے ہیں کہ تمام کائنات علت و معلول کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے اور انسان مجبورِ محض ہے۔ وہ زمانے میں ایک ابدی و ازلی تکرار کے قائل ہیں اور اسے غیر حقیقی و غیر تخلیقی خیال کرتے ہیں۔

افلاطون

افلاطون کے فلسفہ کی بنیاد اُس کے نظریۂ عیون پر قائم ہے۔ افلاطون اٹل اور مستقل حقائق کو عیون کا نام دیتا ہے، جو ازل سے معیّن و مُدوّن ہیں اور عالمِ مادی سے ماورا ہیں۔

[illegible] میں سب سے شمار میں جو ہیں نیکی، سچائی، عدل اور حسن سرفہرست ہیں۔

افلاطون کے نظریہ کے مطابق عالم مادی کے احوال و مظاہر ان تصورات (عینوں) کا عکس ہیں۔ [illegible] انسان اشیاء اور قوانین میں کسی [illegible] کی تبدیلی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ بالفاظ دیگر واقعات کی ترتیب [illegible] پر انسان کو کوئی اختیار و قدرت حاصل نہیں۔ ریاست کے موضوع پر افلاطون کی [illegible] بڑی شہرت حاصل ہے۔ اس میں افلاطون مثالی ریاست کا نقشہ پیش کرتا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔

افلاطون کی اس مثالی ریاست میں مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط پر کوئی پابندی نہیں وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس سے چاہیں کریں۔ ریاست جنسی آزادی کو ضروری خیال کرتی ہے تاکہ [illegible] مرد اور عورت کے ملاپ سے تندرست و توانا بچے پیدا ہوں۔ ریاست [illegible] حوصلہ افزائی کرتی ہے اور کمزور بچوں کے اتلاف کی تحسین کرتی ہے۔ [illegible] ریاست میں کسی بچے کو اپنی ماں یا باپ کا علم نہیں۔

پیدائش کے بعد بچہ ریاست کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جو اس کی پرورش کرتی ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں کھیلتے پڑھتے لکھتے اور ورزش کرتے ہیں۔ [illegible] بات خیال کی جاتی ہے کیونکہ افلاطون کے خیال کے مطابق [illegible] پابندیاں [illegible] چنانچہ اس مثالی ریاست میں [illegible] کے ساتھ ورزش کرنے اور [illegible] کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اس ریاست میں کوئی شے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں حتیٰ کہ عورتیں بھی مشترکہ ہیں اور ان پر سب کا حق ہے۔ افلاطون کی مثالی ریاست میں صرف فلسفیوں کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

نطشے

نطشے کے خیالات کی بوالعجبی قابلِ غور ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے کہ جس طرح انسان حیوانوں سے بلندتر مخلوق بن گیا ہے، اسی طرح موجودہ انسان سے ایک ارفع تر مخلوق پیدا ہو سکتی ہے، جس کو وہ فوق البشر کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ دوسری طرف وہ تکرارِ ازلی کو حقیقت خیال کرتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ ازلی اور ابدی طور پر ہر واقعہ اور ہر ہستی کی تکرار ہوتی رہتی ہے۔ جو کچھ اس وقت موجود ہے وہ کئی مرتبہ پہلے وقوع پذیر ہو چکا ہے اور بتکرار آئندہ بھی ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ اجرام فلکی ہوں یا حشرات الارض، سب پہلے بھی تھے اور بار بار آئندہ

بھی آتے رہیں گے۔ نطشے کے تصورات کا خلاصہ یہ ہے کہ حالات و واقعات کی ترتیب مقرر شدہ ہے۔ اس لئے ان میں نہ تو کوئی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی نئی بات ظہور میں آسکتی ہے۔

اسپنگلر

اکثر مغربی مفکرین تاریخ میں ایک خاص قسم کی جبریت کے قائل ہیں۔ اسپنگلر کی جبریت اس نظریہ پر مبنی ہے کہ زوال ہر تہذیب کا مقدر ہے اور یہ ایک فطری جبر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تہذیبیں بھی افراد کی طرح پیدائش، طفولیت، شباب اور پیری کے ادوار سے گذرتی ہیں اور آخر فنا ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تہذیبوں کے عروج کا راز ایک ایسا معما ہے جسے عقل حل کرنے سے قاصر ہے۔

اُس کے نظریہ کے مطابق ہر تہذیب ایک مخصوص مافنہ مقام اور انداز رکھتی ہے۔ اس لئے دوسری تہذیب والے لوگ اس کو اچھی طرح نہ تو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اپنا سکتے ہیں۔ مذہب کے متعلق اسپنگلر کا نظریہ نہایت مایوس کن ہے۔ وہ مذہب کو تہذیب کا ایک جزو خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "یہ چھ مذاہب، یہودیت، زرتشت، ہندومت، بدھ مت عیسائیت اور اسلام کسی نہ کسی ایک بڑی تہذیب سے پیدا ہوئے ہیں۔

مزید برآں وہ کہتا ہے کہ وہ تمام مذاہب جن میں کسی نجات دہندہ کا تصور کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے مجوسی الاصل ہیں۔ چنانچہ وہ یہودیت، ابتدائی عیسائیت، کلدانی مذہب اور اسلام کو مجوسی کلچر کے مختلف مظاہر خیال کرتا ہے۔

ٹائن بی

ٹائن بی اسپنگلر کی طرح مذہب کو کسی تہذیب کا جزو قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے:

"حقیقی معنوں میں بڑے مذاہب بنیادیں ہیں، جن پر بڑی تہذیبیں تعمیر ہیں۔"

(تاریخ کا مطالعہ جلد ۲ صفحہ ۹۵)

عصر حاضر کے جن مفکرین نے ابن خلدون کے اسلوب نگارش کو اپنانے کی کوشش

Spanglar · Culture & History p. 173 اسپنگلر، کلچر اور تاریخ صفحہ ۱۷۳

کی ہے اُن میں ٹائن بی سرفہرست ہے۔ پروفیسر ٹائن بی نے تاریخِ عالم کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ___________ کام کی وسعت حیرت انگیز اور قابلِ صد ستائش ہے۔ چھ ہزار برسوں میں ظہور پذیر ہونے والی مختلف تہذیبوں کا تجزیہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ٹائن بی تاریخ میں جبریت کا قائل نہیں۔ وہ انسان کو با اختیار ہستی خیال کرتا ہے۔ ٹائن بی کی تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ تہذیب اُس وقت زوال پذیر ہوتی ہے، جب . . نئے . . ر کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تازہ ولولوں اور بلند حوصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹائن بی کے نقطۂ نظر کے مطابق انسان اپنی ذہانت اور قوتِ عمل کی بدولت زوال آمیز اثرات کو خارج کر کے تہذیب میں نیا خون دوڑانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

ٹائن بی مختلف تہذیبوں کے ماخذ، ہیئت، عناصرِ ترکیبی اور باہمی تشابہات پر سیر حاصل تبصرہ کرتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ تہذیبِ مغرب انحطاط پذیر ہو چکی ہے۔ وہ مغرب کی مادہ پرستی کو نوعِ انسانی کے لیے مہلک خیال کرتا ہے اور تیسری عالمی جنگ کے خوف سے لرزاں ہے۔ ٹائن بی محسوس کرتا ہے کہ انسانی مشکلات کا حل ایک عالمگیر معاشرے کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

"میں سویلزیشن کی تعریف روحانی اصطلاح میں کرنا پسند کروں گا۔ شاید یہ ایک ایسے معاشرے کی تخلیق کی کوشش ہے، جس میں تمام انسان مل جل کر ایک خاندان کے افراد کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ میرا یقین ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام معلوم تہذیبوں کی یہی منزل ہے۔"

(تاریخ کا مطالعہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۱۹)

ٹائن بی جن نتائج پر پہنچتا ہے وہ کافی حد تک درست ہیں۔ اُس نے مرض اور کسی حد تک اُس کے اسباب کا پتہ لگا لیا ہے لیکن صحیح علاج کرنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب، مذہب کو نجی معاملہ قرار دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عیسائی ایسا کرنے میں بہت حد تک حق بجانب بھی ہیں۔ عہد نامہ جدید جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کوئی ضابطۂ حیات پیش نہیں کرتا۔ یہ چند ہدایات و نصائح کا مجموعہ ہے۔

کارل مارکس

مارکس کا تصوّرِ تاریخ خالص مادّی ہے۔ اُس کے نزدیک اصل تاریخ ساز قوت معاشی حالات ہیں، جو پورے سماجی نظام کی صورت گری کرتے ہیں۔ اُس کا نظریہ ہے کہ متضاد معاشی حالات طبقاتی کش مکش کو جنم دیتے ہیں جس کی وجہ سے انقلاب برپا ہوتے ہیں ہر انقلاب پرانے سماجی نظام کی بساط اُلٹ دیتا ہے اور نئے سماجی نظام کے لیے راہ ہموار کر دیتا ہے۔ مارکس کے نزدیک یہی طبقاتی کش مکش عمل تاریخ کو متحرک رکھنے کا موجب ہے۔

مارکس نہ تو کسی ماورائے تاریخ عامل کو مانتا ہے اور نہ ہی فرد کے آزادانہ تخلیقی کردار کو تسلیم کرتا ہے۔ اُس کے خیال میں تاریخ کا ارتقا پہلے سے ایک طے شدہ امر ہے اور تاریخ انسانی شعور اور ارادے کی مداخلت کے بغیر اپنی متعینہ منزل کی طرف رواں دواں ہے چنانچہ مارکس کا نظریہ تاریخ قطعی طور پر لادینی ہے اور دوہری جبریت کا حامل ہے۔

لادینی فلسفۂ تاریخ کوئی رہنمائی پیش نہیں کرتا

علم التاریخ کی غایتِ اولیٰ مستقبل کے متعلق رہنمائی پیش کرنا ہے۔ مغرب کے تمام نامور مورخین ٹائن بی وغیرہ ہارتھروپ، ہرڈر، سارکن، اسپنگلر اور ٹائن بی وغیرہ تہذیبوں کی ساخت وریخت کے تجزیئے سے آگے قدم نہیں مارتے۔ وہ ہر تہذیب کا ماخذ، ہیئتِ ترکیبی، نزعات مشترک اوضاع و اقدار بڑی تدقیق و تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن اُنہیں نہ تو فرد کے ساتھ بطور انسان کوئی دلچسپی ہے اور نہ اجتماعی زندگی کی اندرونی پراگندگی و زبوں حالی سے کوئی تعلق۔ وہ تہذیب کو بطور تہذیب دیکھتے ہیں۔ اُنہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ اُس تہذیب کے اندر انسان پر کیا گذری۔ ان مفکرین کی تگ و تاز خارجی احوال و ظروف کی نقش گری تک محدود رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ بانیانِ مذہب کی تعلیم کو بھی زیر بحث نہیں لاتے۔ جو کہ اصل چیز ہے۔

ان مفکرین کی جانچ کا معیار خالص مادی ہے، چنانچہ انہیں انسانی قلب و روح کے زخموں پر کوئی کسک محسوس نہیں ہوتی۔ اُن کا موضوع عروجِ آدم نہیں عروجِ تہذیب ہے زوالِ آدمیت نہیں انتشارِ تہذیب ہے۔

اسلام کا نظریۂ تاریخ

اسلام کا نظریۂ تاریخ اپنی ہیئت، معنویت اور نتائج کے اعتبار سے تمام نظریات سے مختلف اور منفرد ہے۔ اس میں اور دوسرے نظریات میں کوئی قدر مشترک نہیں جزئی تشابہات اُن لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہیں جو اسلام کی رُوح سے ناواقف ہیں۔

اسلام میں نہ تو مادیت کی جبریت ہے اور نہ مغرب کی بے لگام آزادی۔ اسلام نہ تو انسان کو عاجز و بے بس قرار دیتا ہے اور نہ ہی فوق الفطرت قوتوں کا مالک۔ طاقت کا سرچشمہ نہ تو کوئی فردِ واحد ہے اور نہ ہی عوام۔ طاقت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے اور انسان اُس کا نائب ہے۔

نیابتِ الٰہیہ کی بدولت انسان، اشرف المخلوقات کے مقامِ جلیلہ پر فائز ہے۔ مادہ پرستوں کے نکتۂ نظر کے برعکس انسان مادی فطرت کا عکس یا بے جان میکانیہ نہیں بلکہ مادی فطرت اُس کے آگے سرنگوں ہے۔

اسلام کے مطابق انسان باشعور، بارادہ اور بااختیار ہستی ہے اور حالات و واقعات کا رُخ موڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے اور انسان مکافاتِ عمل سے نہیں بچ سکتا۔ اس معاملے میں فرمانِ الٰہی بڑا واضح ہے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ

(ترجمہ) پس جو شخص ذرہ برابر نیک عمل کرے گا اُس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بُرا عمل کرے گا اُس کا نتیجہ بھی دیکھ لے گا۔ (پارہ ۳۰ سورۃ ۹۹ آیت ۸)

مارکس کہتا ہے کہ تاریخ خود بخود اپنی متعینہ منزل کی طرف گامزن ہے اور تحرک کے لیے انسانی یا ماورائے تاریخ، بالاتر قوت کی محتاج نہیں۔ مسلمان ماورائے تاریخ بالاتر قوت پر ایمان رکھتا ہے اور اپنے آپ کو اُس کے سامنے جواب دہ خیال کرتا ہے کیونکہ تاریخ سازی میں انسانی

اعمال کو اصل مقام حاصل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

(ترجمہ) اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں، مگر وہی ہے جو وہ کوشش کرتا ہے۔

(پارہ ۲۷ سورۃ ۵۳ آیت ۳۹)

قرآن پاک میں اقوام کے عروج و زوال کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ واقعات داستان سرائی کی خاطر بیان نہیں کیے گئے ان میں عبرت و حکمت کے لازوال خزانے ہیں۔ قرآن پاک میں ان اسباب کی طرف واضح اشارات موجود ہیں، جو قوموں کے زوال یا عروج کا باعث ہوتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ۔

(پارہ ۱ سورۃ ۲ آیت ۱۳۴)

(ترجمہ) وہ اُمت گزر چکی ہے جو کچھ اُس نے کمایا تھا اُسے ملے گا اور جو تم کماؤ گے وہ تمہیں ملے گا۔

عمل کو اس کے نتائج سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جو قومیں حق پرستی کی بدولت راست رو اور راست باز ہوتی ہیں وہ سربلند رہتی ہیں اور جو جادۂ حق سے ہٹ جاتی ہیں وہ قعر مذلت میں جا گرتی ہیں۔ اس ارشاد ربانی پر غور فرمایئے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

(پارہ ۱۳ سورۃ ۱۳ آیت ۱۱)

(ترجمہ) خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا، جس کو خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔

اس عالم کون و فساد میں کوئی شے ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ عروج و زوال تعمیر و تخریب اور حیات و ممات کا سلسلہ آن جاری ہے۔ کسی فرد، قوم یا سلطنت کو دوام نہیں۔ ہر ملت کے لیے موت ہے۔ (ولکل امۃ اجل) اور سب کو اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ (الی اللہ مرجعکم جمیعا) حی و قیوم تو صرف اُس کی ذات ہے۔

فلسفۂ تاریخ کو سورۂ عصر میں انتہائی قطعیت اور کمال درجہ بلاغت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا ایک ایک لفظ ایمائیت کا ایسا شاہکار ہے کہ فلسفۂ تاریخ

کی جامع و مانع تدوین کے لیے کسی اور طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔

اس سورۃ میں مرورِ ایام کی طرف اشارہ ہے کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور ہر وہ انسان جو اس وقت کو اچھے مصرف میں نہیں لاتا، وہ خسارے میں ہے۔ وقت کا اچھا مصرف اعمالِ صالح کا بجا لانا ہے۔ اللہ تعالیٰ زمانے کو بطورِ شہادت پیش کرتے ہیں کہ اس زندگی سے فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں اور دوسرے کو بھی حق پرستی اور ثباتِ قدمی کی تلقین کرتے ہیں۔

اکثر مفسّرین جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے زمانے کی دولابی گردش پر ایمان رکھتے ہیں اور ازلی و ابدی تکرار کے چکّر سے نکلنے نہیں پاتے۔ قرآن اس نظریہ کی سختی سے تردید کرتا ہے۔ قرآن پاک کے مطابق حیات بہ تقاضائے فطرت ہر آن سرگرمِ رفتار ہے۔ اس میں کہیں جمود نہیں۔ اس کا کارواں ہر آن رواں دواں ہے۔ یہ نہ کہیں رکتا ہے، نہ دم لیتا ہے، اور نہ قیام کرتا ہے۔ یہ برابر حرکت پذیر ہے اور مسلسل نو بہ نو منزلوں کی طرف ارتقا پذیر ہے۔ تاریخ زندگی کے اسی جزئی عمل کی آئینہ دار ہے اور زندگی کی طرح خود بھی حرکت پذیر ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت پر غور فرمائیے:

يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۔ (پارہ ۲۷ سورۃ ۵۵ آیت ۲۹)

یوم سے مراد عموماً چوبیس گھنٹوں کا دن ہے۔ لیکن اکثر اس سے مراد زمانہ کی کوئی مدّت ہوتی ہے خواہ وہ بہت ہی کم ہو یا بہت ہی زیادہ۔ چنانچہ کل یوم ھو فی شان میں یوم سے مراد ایک آن یا آن کا کوئی حصّہ ہے۔

اس نیرنگیوں کی جلوہ گاہ اور انقلابات کی آماجگاہ دنیا میں خالقِ عالم کی کارفرمائی ہر لمحہ جاری ہے۔ وہ تخلیقِ نو کے ساتھ ساتھ مخلوق شے کی حالت اور صورت بھی بدلتا رہتا ہے اُس کی صورت گری اور حسن کاری ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جب تک اس آیت کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا، غالبؔ کے اس شعر کی عظمت کا احساس نہیں ہوا تھا ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اسلام اور وحدتِ انسانی

لادینی فلسفہ وحدتِ انسانی کے لیے کوئی عالمگیر بنیاد مہیّا نہیں کرتا۔ مادیت نے نوعِ انسان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ہر گروہ، ہر طبقہ اور ہر قوم اپنی تعمیر کے لیے دوسروں کی تخریب اور اپنی بقا کے لیے دوسروں کی فنا کو ناگزیر خیال کرتی ہے۔ شخصی، طبقاتی اور قومی دنائت و تقاضات نوعِ انسانی کے حقوق و عواطف سے متبائن ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسانی ذہن کی ہر اختراع اور ہر تخلیق، خواہ وہ کسی ضابطہ کی صورت میں ظہور پذیر ہو، یا قانون و دستور کی شکل میں اُس پر متعلقہ فرد یا طبقہ کی خواہشات و شہوات کی مہر ثبت ہوگی

دراصل انسان کو یہ توفیق کہاں کہ وہ نوعِ انسانی کے تمام طبقات اور فطرتِ انسانی کے تمام داعیات کے ساتھ انصاف کر سکے۔ یہ کام تو اُس ذات کا حصہ ہے، جو ہر قسم کی [illegible] سے مبرّا ہے، ———— جو محتاج نہیں حاجت روا ہے، مخلوق نہیں خالق ہے، مرزوق نہیں رازق ہے، مربوب نہیں رب ہے۔ رب المسلمین نہیں رب العلمین ہے۔
اسلام کی عالمگیر نوعیت یا عالم گیر وسعت کا یہ قطعی ثبوت ہے کہ اس کی ابتدا ہی تمام جہانوں کی ربوبیت سے ہوتی ہے۔ الحمد للّٰہ رب العٰلمین میں جہاں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی، وہاں نسلِ انسانی کی وحدت بھی بیان فرما دی اور طبقات و اقوام اور رنگ و نسل کے تمام بُت پاش پاش کر کے رکھ دیے۔

باب ۲

تکوینِ کائنات

تکوینِ کائنات اور یونان کے فلسفی

طالیس (۶۲۴ ق م) پہلا یونانی مفکر متصور ہوتا ہے۔ اُس نے کوئی تحریر نہیں چھوڑی، اس نے کہا کہ کائنات پانی سے بنی ہے۔

اناکسی مینڈر نے طالیس کے نظریہ کی تردید کی اور کہا، چونکہ کائنات لامحدود ہے اس لیے اس کی تکوین کسی ایسے عنصر سے نہیں ہو سکتی جو محدود اور فنا پذیر ہو۔ اس بنا پر اُس نے کہا، کائنات پانی سے نہیں بنی جو محدود اور فنا پذیر ہے۔

ہیرقلیطس نے حرکت و تغیر کا نظریہ پیش کیا۔ وہ کہتا ہے، کہ کوئی چیز جامد و ساکت نہیں، ہر چیز دائماً تغیر پذیر ہے۔ اس لیے تغیر حقیقت اور ثبات فریب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کی تکوین آگ سے ہوئی ہے۔ وہ آگ کو خدا یا آفاقی ذہن مانتا ہے، جو تمام اشیاء میں وحدت پیدا کرتا ہے اور تغیر کا باعث بنتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر شے میں اضداد ہیں، جن کی آویزش سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ حواس پر عقل کی برتری تسلیم کرتا ہے اور عقل ہی کو کائنات کے علم کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

پارمی نائیڈس، ہیرقلیطس کے نظریۂ حرکت و تغیر کی تردید کرتا ہے۔ وہ وحدتِ وجود کا قائل ہے، اور محسوسات کو باطل گردانتا ہے۔ وحدتِ وجود کے نظریہ کے مطابق حقیقتِ مطلق وجود ہے اور حواس و مظاہر فریبِ نظر ہیں۔ اس لیے حرکت و تغیر، مدرکات و مظاہرات اور زمان و مکان سب غیر حقیقی ہیں۔

ایمپی ڈیکلس (۴۹۰ - ۴۳۰ ق م) ایک طبیب تھا اور اُن قوتوں کے معلوم

کرنے کا آرزو مند تھا جو عالمِ فطرت میں کارفرما ہیں۔ اسے فطرت اور مافوق الفطرت دونوں میں گہری دلچسپی تھی۔ وہ تغیر کو قلبِ ماہیت نہیں، تبدیلی ترتیب خیال کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر مادی شے کے اجزائے ترکیبی جگہ بدلتے ہیں اور نئی تبدیلی عمل میں آتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات عناصرِ اربعہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی سے بنی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ ایک قسم کا مادہ، دوسری قسم کے مادے میں نہیں تبدیل ہو سکتا، البتہ ان عناصر کے امتزاج سے زمین جیسی ٹھوس اشیاء معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ اور جب ان میں انتشار واقع ہوتا ہے تو فنا ہو جاتی ہیں۔

حیات و کائنات اور قرآن

انسان فطرتاً اپنی پیدائش، اپنی زندگی اور اِرد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے متعلق متجسس ہوتا ہے، وہ ٹھیک طور پر جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ اُس کی حیثیت کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ اور ان سب کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کوئی مذہب، کوئی فلسفہ ان چیزوں کی ماہیت اور باہمی تعلق کو متعین نہیں کرتا۔ یہ کمال قرآن کو حاصل ہے کہ وہ ان سوالوں کا واضح اور قطعی جواب بہم پہنچاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:-

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۱ آیت ۱۱)

(ترجمہ) یہ اللہ کی پیدائش ہے۔

قرآن اللہ، انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو یوں بیان کرتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ۔ (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۲ آیت ۴)

(ترجمہ) اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ

سِتَّةِ اَیَّامٍ - (پارہ ۸ سورہ ۷ آیت ۵۴)

(ترجمہ) تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین چھ وقتوں میں پیدا کیے۔

وہ یوم جس کو ہم دن کہتے ہیں قیدِ مکانی کی پیداوار ہے۔ چنانچہ یہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد ظہور میں آیا۔ قرآن میں یوم کا مفہوم زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔

پس یوم کے معنی عام وقت ہے جو تمام حدبندیوں سے آزاد ہے۔ کسی لمحہ کے ایک حصّہ سے لے کر پچاس ہزار سال کو بھی یوم کہا جا سکتا ہے۔

چھ دنوں سے مراد چھ مراتب ہیں۔ سورۃ المؤمنون میں انسان کی پیدائش کے چھ مراتب ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۝ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (پارہ ۱۸ سورۃ ۲۳ آیت ۱۴، ۱۲)

(ترجمہ) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اُسے ایک مضبوط ٹھہرنے کی جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا، پھر ہم نے نطفہ کو لوتھڑا بنایا اور لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا، اور گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں بنائیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اُسے ایک اور پیدائش دے کر اٹھا کر کھڑا کیا۔ پس اللہ بابرکت ہے جو سب بنانے والوں سے بہتر ہے۔

ایک "اور پیدائش" سے مراد:

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (پارہ ۲۱ سورت ۳۲ آیت ۹)

(ترجمہ) پھر اُسے ٹھیک بنایا اور اپنی رُوح اس میں پھونکی۔

اس طرح زمین و آسمان کی ہر چیز کی پیدائش میں چھ نظر آتے ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک

حدیث میں چھ مراتب بتائے گئے ہیں۔ اول، مٹی کا پیدا ہونا، پھر اس میں پہاڑوں کا بننا، پھر درختوں کا پیدا ہونا، پھر نور کا پیدا ہونا، پھر جانداروں کا پیدا ہونا، پھر اشرف المخلوقات انسان کا پیدا ہونا۔

قرآن نوعِ انسانی کے باہمی تعلق کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً۔

(پارہ ۴ سورۃ ۴ آیت ۱)

(ترجمہ) اے لوگو! اپنے رب کی اطاعت کرو، جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا، اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً۔ (پارہ ۱۱ سورۃ ۱۰ آیت ۱۹)

(ترجمہ) اور سب لوگ اُمّت واحدہ ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نوعِ انسانی کا جوہرِ تخلیق ایک ہے۔ سب لوگ متحدالاصل ہونے کی وجہ سے اُمتِ واحدہ ہیں اور آپس میں برابر ہیں۔ اسلام وحدتِ انسانی اور مساوات بین الناس کا علمبردار ہے۔ یہ نسلی، گروہی، اجتماعی اور جغرافیائی تفریقات کو مٹاتا ہے اور نوعِ انسانی کے اتحاد کے لیے مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔

قرآن انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو یوں بیان کرتا ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ۔

(پارہ ۱۷ سورۃ ۲۲ آیت ۶۵)

(ترجمہ) کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں تمہارا مطیع بنا دیا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ زمین ہی نہیں ارض و سما سب انسان کے لیے مطیع ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۱ آیت ۲۰)

(ترجمہ) کیا تو نہیں دیکھتے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین پر ہے، تمہارے لیے مسخر بنا دیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا خالق ہے اور زمین و آسمان سب اس کی مخلوق ہیں۔ تمام انسان نوعی اعتبار سے برابر ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور تمام مادی فطرت اس کے تابع ہے۔

تکوینِ کائنات کے متعلق قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ ابتدا میں صرف دھواں (گیس) تھا جسے خدا نے اکٹھا کیا اور اپنا حکم جاری کیا۔ آج سائنس بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ابتدا میں گیس تھی۔ پھر کیمیائی عناصر پیدا ہوئے۔ جن سے بعد میں دوسرے اجرام کی تشکیل عمل میں آئی۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ۝

(پارہ ۲۴ سورۃ ۴۱ آیت ۱۱)

(ترجمہ) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دھواں تھا۔ سو اُسے اور زمین سے کہا، آ جاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا ہم دونوں خوشی سے حاضر ہیں۔

باب ۴

لادینیت بطور فکری تحریک

اس باب میں نمائندہ مادہ پرست مفکرین کے خیالات مجملاً بیان کیے جاتے ہیں، تاکہ لادینیت کو بطور فکری تحریک سمجھا جا سکے اور یہ معلوم ہو سکے کہ کون کون سے خیالات کس کس گوشے سے آتے ہیں۔

دیما قریطس (۴۶۰ - ۳۷۰ ق م) پکا مادہ پرست ہے، وہ کہتا ہے کہ تمام مرکبات ایٹم سے بنے ہیں جو لاتجزّی ہیں اور اُن کی تبدیلی کی نوعیت کیفیتی نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تبدیلی صرف ایٹم کی ترتیبِ مکانی میں ہوتی ہے کیفیت میں نہیں ہوتی۔ نتیجۃً ہر شے کے خواص کا مدار ایٹم کی ترتیب، ہیئت اور حجم پر ہوتا ہے وہ کہتا ہے ایٹم اور خلا حقیقتِ مطلق ہے اور باقی حقیقتیں اضافی ہیں جو اس حقیقتِ مطلق (ایٹم اور خلا) سے حاصل کی جاتی ہیں۔

سقراط (۳۹۹ ق م) خودشناسی کی تعلیم دیتا ہے۔ اُس کے فکر و فلسفہ کا محور انسان ہے۔ وہ علم کو نیکی اور جہالت کو بدی خیال کرتا ہے۔ سقراط کے تصورِ الوہیت کا سُراغ اس مکالمے سے ملتا ہے جس میں وہ اڈمنٹس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ: خدا تمام حوادث و افعال کی علت نہیں، جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے بلکہ وہ انسانی حالات کے نہایت قلیل حصہ کی علت ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان کی برائیاں اس کی بھلائیوں سے کہیں زیادہ ہیں اور برائیوں کی علت خدا کی ہستی نہیں ہو سکتی جو کہ خیر ہی خیر ہے۔ اس لیے صرف خیر کو خدا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور شر کی علت کسی اور جگہ تلاش کی جا سکتی ہے۔

سقراط حقیقت کو بذریعہ عقل سمجھتا ہے اور علت العلل کو عقلِ اوّل کا نام دیتا

ہے۔ سقراط کے مکالمات میں تعمق کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ماورا عقل کسی الوہی قوت کا متلاشی نہیں، وہ عقل ہی کو انسانی اعمال کی قوتِ موثرہ خیال کرتا ہے۔

افلاطون (پیدائش ۴۲۷ ق م) کے نظامِ فلسفہ میں عقلِ استدلالی بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہی عین و کائنات کا ادراک کرتی ہے۔ افلاطون کا تصورِ الوہیت سقراط سے مختلف نہیں۔ افلاطون کہتا ہے کہ حوادثِ عالم اور افعالِ انسانی کا بیشتر حصہ خدا کے دائرہ تصرف سے باہر ہے کیونکہ دنیا میں بدی زیادہ ہے اور نیکی کم اور خدا بدی کا خالق نہیں ہو سکتا۔ افلاطون کا سارا تفکر نیر اور عقلِ استدلالی کے گرد گھومتا ہے۔ اور انہی کو اس کے نظامِ فلسفہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

ارسطو (پیدائش ۳۸۴ ق م) کے نظامِ فلسفہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ کوئی شے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی۔ ارسطو وجود کی دو قسمیں بتاتا ہے: وجود بالقوہ اور وجود بالفعل۔ وہ کہتا ہے کہ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ جو شے بالقوہ موجود ہوتی ہے وہ بالفعل ہو جاتی ہے۔

ارسطو کہتا ہے کہ خدا کائنات کا خالق نہیں، وہ صرف حرکتِ کائنات کا سبب ہے، اور چونکہ خدا جذبات سے پاک ہے اس لیے وہ اس دنیا سے لاتعلق ہے۔ انسانوں کی دعاؤں اور ان کے دکھ درد سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ وہ بےحس ہے اور بےپروا ہے۔

رُوما کے مفکرین:

اپیکورس (پیدائش ۳۴۲ ق م) کے خیال میں کائنات کسی خالق کی تخلیق نہیں۔ یہ سراسر مادی ہے، اور میکانکی اسباب کا اتفاقی نتیجہ ہے۔ اپیکورس کے فلسفہ پر دیما قریطس کے نظریات کی گہری چھاپ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام اشیاء ایٹم سے بنی ہیں اور صدمات ہی تکوینِ کائنات کا باعث ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سالمات کا یہ جوہری نظام خودزا اور خودکار ہے۔ وہ زندگی کو حادثہ اور فطرت کو سوتیلی اولاد خیال کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے خیال کے مطابق زندگی میں غایت و مقصد کی تلاش بےسود ہے۔ اس لیے اس کے نزدیک مذہب، حیات بعد ممات، اخلاقی حدود اور معاشرتی قیود

سب اخلاقی باتیں ہیں۔ وہ زندگی کو دیوتاؤں کے عذاب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

لکریشس اپنی فلسفیانہ نظم "ماہیت اشیاء" کی بدولت مشہور ہے۔ لکریشس کے نظریات میں دیماقریطس اور ایپیکورس کے خیالات کا عکس ملتا ہے۔ وہ مادے کو ازلی و ابدی خیال کرتا ہے۔

لکریشس مذہب کو انسانی دکھوں کا موجب خیال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حیات بعد موت کے تصور کو دل سے نکال دینا چاہیئے۔ وہ نظم "ماہیت اشیاء" میں لکھتا ہے:

"مذہب کے باعث انسان پر بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہوئی ہیں اور ہزاروں انسانوں کا خون بہا ہے"

لکریشس کی یہ نظم مادہ پرستوں کا صحیفہ ہے۔

یورپ کے مختلف ممالک کے مفکرین

ڈیکارٹ (پیدائش ۱۵۹۶ء) فرانسیسی فلسفی ہے اور علم الطبیعات کا بڑا ماہر ہے۔ انسانی جسم، ذہن اور خدا اس کے فلسفے کے عناصر ترکیبی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات خدا کی تخلیق ہے اور ہر شے مقررہ قوانین کے تحت حرکت کر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیکارٹ ایک طرف تو وجود خداوندی کا اقرار کرتا ہے اور دوسری طرف مادی زندگی کی جبریت کو مستقل بالذات خیال کرتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم، حیوانی جسم سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، دونوں مشین کی طرح خودکار ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ حیوان ذہن و شعور سے عاری ہے اور انسان ذہن و شعور کا مالک ہے۔

ہولباخ (پیدائش ۱۷۲۳ء) جرمن میں پیدا ہوا لیکن بعد میں پیرس میں آباد ہو گیا۔ ہولباخ پکا مادہ پرست ہے۔ وہ خدا کا منکر ہے۔ روح کو مادی اور مذہب کو پروہتوں اور پادریوں کی فریب کاری خیال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا اقرار کرنے سے پرستش لازم ہو جاتی ہے، جس سے انسان فطری اخلاق سے محروم ہو جاتا ہے۔

ڈیکارٹ انسانی اور حیوانی جسم کو کل کی مانند قرار دیتا ہے لیکن انسانی ذہن و شعور کی کارفرمائی سے انکار نہیں کرتا۔ ہولباخ اس امتیاز کو بھی ختم کر دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کا جسم بھی حیوانات کی طرح ایک خود کار کل ہے اور بس۔

ڈیوڈ ہیوم (پیدائش ۱۷۱۱ء) سکاچ فلسفی ہے۔ اس کا فلسفہ سراسر سلبی ہے وہ خدا، مذہب، کائنات، سلسلۂ علت و معلول اور عقل سب کا منکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صداقت کا کہیں وجود نہیں۔ ساری کائنات پر اندھی فطرت محیط ہے۔ جس کے بے رحم آغوش میں نامکمل بچے پرورش پاتے ہیں، وہ بائیبل سے گریزاں ہے، پادریوں سے متنفر ہے اور مذہب سے نالاں ہے۔

ہیوم کہتا ہے کہ علت و معلول کی تلاش فضول ہے۔ کوئی تعہ دوسرے واقعہ کی علت نہیں بن سکتا۔ واقعات کے مابین کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظریہ کہ واقعات و تجربات میں کوئی مخفی رابطہ ہے، فرضی ہے اور بے بنیاد ہے۔ یہ مفروضہ دراصل سطحی مشاہدے پر مبنی ہے۔

ہیوم کا فلسفہ دو دھاری تلوار ہے۔ وہ ایک دھار کے ساتھ مذہب کا گریبان چاک کرتا ہے اور دوسری کے ساتھ عقلیت پرستی کا سر قلم کرتا ہے۔

ڈارون (پیدائش ۱۸۰۹ء) کے نظام فلسفہ کی بنیاد نظریۂ ارتقا پر ہے۔ نظریۂ ارتقا کے دو عوامل بیان کیے جاتے ہیں: خارجی اور داخلی۔ ڈارون داخلی عامل کو رد کرتا ہے اور صرف خارجی عامل کو موثر سمجھتا ہے، جس کی تین صورتیں ہیں: خوراک، طبعی ماحول سے مطابقت، عدم مطابقت اور غذا و آب و ہوا کی تبدیلی۔

خوراک کا تصور مالتھس کے نظریۂ آبادی سے ماخوذ ہے۔ جس کی رو سے ذی حیات آبادی میں بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے اور خوراک کا حصول مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ انواع میں بقائے ذات کے لیے کشمکش جاری

رہتی ہے۔ دوسری صورت طبیعی ماحول سے مطابقت یا عدمِ مطابقت ہے۔ جو حیوانات خارجی ماحول سے مطابقت پیدا کر لیتے ہیں، وہ قائم رہتے ہیں، باقی نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ خارجی ماحول ایک سا نہیں رہتا۔ آب و ہوا اور غذا کی تبدیلیاں بعض اوقات ایسی ہوتی ہیں کہ بعض حیوانات اُنہیں برداشت نہیں کر سکتے اور فنا ہو جاتے ہیں۔

یہ کشمکش جسے ڈارون جہد للبقا کا نام دیتا ہے۔ بقا کے اصلح پر منتج ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر انواع کی کشمکش میں وہی انواع زندہ رہتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں، جن میں دوسری انواع کے مقابلے میں زیادہ برداشت اور قوت ہوتی ہے۔ باقی فنا ہو جاتی ہیں۔

ڈارون اس نظریۂ ارتقا کی بنیاد پر اپنے فکر کی عمارت تعمیر کرتا ہے، اور بالآخر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسان بھی حیوان کی ترقی یافتہ صورت ہے اس کا گمان ہے کہ انسان حیوانات بوزنہ کی کسی نوع (بندر وغیرہ) سے بتدریج ترقی کر کے اس مقام پر پہنچا ہے۔

فرائڈ (پیدائش ۱۸۵۹ء) کو مذہب کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، وہ کہتا ہے:

"یہ بات درست نظر نہیں آتی کہ کائنات میں کسی ایک ایسی طاقت کا وجود ہے جو پدرانہ شفقت کے ساتھ ہر ایک فرد کی فلاح کا خیال رکھتی ہے اور اپنے حلقہ میں شامل لوگوں کو خوش کُن انجام سے ہمکنار کرتی ہے اس کے برعکس انسانوں کی تقدیر کسی بھی عالمگیر قانونِ انصاف سے متضاد ہے۔ زلزلے، سیلاب، آتشزدگی کے حادثات، نیک و عبادت گزار، اور گنہگار و منکرِ خدا میں کوئی تمیز نہیں کرتے .... یہ بات بھی کسی طرح درست کہ نیکی کا صلہ ملتا ہے اور بدی کی سزا۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ظالم مکار اور بے اصول دنیوی فوائد حاصل کر لیتے ہیں اور نیک خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ انسانی تقدیر، تاریک، بے حس اور غیر شفیق قوتوں کے ہاتھ ہے۔ خدائی انصاف کے اس تصور کا کہیں نشان نہیں ملتا، جو مذہبی عقیدے کے مطابق ساری دنیا میں حکمران ... سائنس کی عظمت کم کرنے کی کوشش،

اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی کہ وہ ہمیں خارجی دنیا پر انحصار کرنا سکھاتی ہے جبکہ مذہب محض ایک طفلانہ وہم ہے۔

EREUD : Great thinkers of the Western world, Encyclopaedia Britanica.

تحلیل نفسی اور لاشعور پر فرائڈ کے نظریات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمام ذہنی عوارض، جنسی جذبے کے دباؤ کا نتیجہ ہیں۔ اگر جنسی خواہشات کی تسکین ہوتی رہے تو انسان ذہنی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

فرائڈ لاشعور کو بہت اہمیت دیتا ہے، اُس کا دعویٰ ہے کہ انسانی کردار زیادہ تر لاشعور کے جبلی میلانات و تقاضات کا نتیجہ ہے۔ اور یہ لاشعور اپنی اصل کے اعتبار سے تقریباً جنسی اور شہوانی ہوتا ہے۔ وہ تو یہاں تک دعویٰ کرتا ہے کہ یہ جنسی میلان لڑکپن یا جوانی کی پیداوار نہیں بلکہ بچے میں شروع ہی سے موجود ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر نر بچہ اپنی ماں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن راستے میں باپ کو حائل پاتا ہے اسی طرح ہر مؤنث بچہ اپنے والد کو حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے لیکن راستے میں ماں حائل ہوتی ہے۔ بچے (لڑکا یا لڑکی) چونکہ اپنے والدین سے لڑنے کی ہمت نہیں پاتے، اس لیے جو چیز اُنہیں عالم بیداری میں نہیں ملتی وہ خیال و خواب کی دنیا میں حاصل کر لیتے ہیں۔ لہٰذا لڑکا جو والدہ کو چاہتا ہے وہ خیال و خواب کے عالم میں والد کا کردار ادا کرتا ہے، اور لڑکی جو باپ سے محبت کرتی ہے وہ والدہ کا کردار ادا کرتی ہے۔

فرائڈ اس نظریہ کی بنا پر کہتا ہے کہ ماں باپ بچوں کے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے لڑکا باپ کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور لڑکی ماں کے۔

باب ۵

لادینیت اور سیاست

ملحدین کا ایک گروہ حکمرانی کے لیے جبر و تشدّد کو ناگزیر خیال کرتا ہے ۔ کوتلیا ۔ میکاولی اور نطشے اس گروہ کے قائدین ہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے افکار و نظریات کے اثرات بڑے گہرے اور دُور رس ہیں ۔

جس میں لومڑی ، گیدڑ ، بچھو ، بھیڑیا ، شیر ، ہاتھی اور سانپ کی طرح کے جانور ہیں ۔ حیوانات کی دنیا میں جو قانون رائج ہے اس کا نام " جس کی لاٹھی اس کی بھینس " ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوتلیا ، میکاولی ، نطشے ، اور نطشے نے اس قانون کا گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ جنگل کا قانون بہترین قانون ہے اس لیے انسانی دنیا میں بھی اس کا نفاذ لازمًا ہونا چاہیئے ۔

انسانیت کے یہ محسنین بادشاہوں کو ریاکاری ، مکاری ، دغابازی اور ظالمانہ تشدّد کی تلقین کرتے ہیں ۔ ان کے خیال میں عوام بھیڑوں سے کسی حیثیت میں بہتر نہیں ۔ کیونکہ نہ وہ سوچ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی محسوس کر سکتے ہیں ۔ وہ گونگے ہیں ، بہرے ہیں اور اندھے ہیں ۔

ان کرم فرماؤں کے نقطۂ نظر کے مطابق عام آدمی کی خلقت کا صرف ایک مقصد ہے کہ وہ اپنے مختارِ کل آقا کے احکام کی تعمیل کرے ، جس طرح جنگل میں بھیڑیئے اور شیر کو ہر جانور کے جسم میں پنجہ گاڑنے اور اُس کا خون چوسنے کا حق حاصل ہے بعینہٖ عظما (فوق البشر لوگ) کو انسان کے معاملے میں حق و اختیار حاصل ہے ۔

فوق البشر کے تصور نے بدترین ڈکٹیٹرشپ کو جنم دیا جنھوں نے انسانی زندگی کے خون سے ظلم و تشدد کے عفریت کی پرورش کی ہے ۔ فوق البشر کا تصور ڈکٹیٹروں کا وہ خدائی اور خلق خدا کی کامل تذلیل پر مبنی ہے ۔

کوتلیا

کوتلیا چندر گپت موریہ کا مشہور وزیر تھا۔ کوتلیا کے معنی مکار اور دغا باز کے ہیں۔ کوتلیا اپنی تصنیف ارتھ شاستر میں بادشاہ کو مکر و فریب اور دجل و تلبیس کی خوب تعلیم دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بادشاہ کو جابر و قاہر ہونا چاہیئے کیوں کہ ظلم و تشدّد سلطنت کے قیام و بقا کے لیے اشد ضروری ہے۔ اس کے خیال میں بادشاہ کے اختیارات کی کوئی حد نہیں اور وہ رعایا کے ہر معاملے میں مداخلت کا حق رکھتا ہے۔ کوتلیا بادشاہ کو ہر وقت چوکس اور باخبر رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ خفیہ پولیس کے محکمہ کے قیام کی تجویز پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> "اس محکمہ کے اختیارات لامحدود ہونے چاہئیں تاکہ وہ دشمنوں اور مشتبہ لوگوں کی پوری طرح سرکوبی کر سکے۔ کوتلیا تعذیب و تشدّد کو یوں بھی شاہی وقار کے لیے ناگزیر خیال کرتا ہے۔"

نکولی میکاولی

نکولی میکاولی اٹلی کے شہر فلورنس کا باشندہ تھا۔ کئی سال سرکاری ملازمت میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہا۔ اس زمانے میں اٹلی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، جو آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں۔ فرانس کے ساتھ جنگ ہوئی تو میکاولی کو جلاوطن کر دیا گیا۔

میکاولی اپنے ملک کی پس ماندگی اور زبوں حالی پر بہت کڑھتا تھا۔ وہ اٹلی کو ہمسایہ ملکوں کی طرح متحد اور مضبوط دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس نے جلاوطنی کی حالت میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پرنس" لکھی۔ اس کتاب میں وہ بادشاہ کو رموزِ مملکت کی تعلیم دیتا ہے اور حصولِ اقتدار اور بقائے اقتدار کے طریقے سکھاتا ہے۔

چونکہ میکاولی اٹلی کو متحد و مستحکم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ قومیت پرستی کے جذبہ کو پوری طرح اُبھارتا ہے اور بادشاہ کو قوت و جبروت کے کامل اظہار کی تلقین کرتا ہے۔

میکاولی مکر و فریب کو کامیابی کا واحد ذریعہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کو نصیحت کرتا ہے:

"میں جانتا ہوں کہ ہر ایک شخص اس بات کو تسلیم کرے گا کہ بادشاہ کا اعلیٰ اوصاف کا مالک ہونا ایک قابلِ تعریف بات ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی بات ہے جس کی اجازت نہ تو انسانی حالات دیتے ہیں اور نہ ہی کوئی فرد اِن تمام اوصاف کا حامل ہو سکتا ہے۔ اس لیے بادشاہ کے لیے شر انگیز نیکیوں سے اجتناب لازم ہے جن سے ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اچھے کام تباہی کا موجب بنتے ہیں اور بُرے کام استحکام و خوشحالی کا۔"

"ہمارے زمانے کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہی حکمران کارہائے نمایاں سرانجام دینے میں کامیاب ہوئے ہیں جو نیک نیتی کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے اور جو کمال دانشمندی سے لوگوں کے ذہن میں انتشار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے بادشاہ (بدنیت) آخر کار اُن حکمرانوں (نیک نیت) پر فتح حاصل کر لیتے ہیں جو وفاداری کو اپنا شعار بناتے ہیں۔"

میکاولی بادشاہ کو کبھی شیر اور کبھی لومڑی بننے کی ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"بادشاہ کو درندہ صفت ہونا چاہیئے تاکہ وہ شیر اور لومڑی دونوں کی نقل کر سکے۔ شیر خطرات کا پتہ نہیں لگا سکتا، اور لومڑی اپنے آپ کو بھیڑیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اس لیے بادشاہ میں شیر اور لومڑی دونوں کی خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے، تاکہ بادشاہ لومڑی کی طرح خطرات کا پتہ لگا سکے، اور شیر کی طرح گرج کر بھیڑیوں کو ڈرا سکے۔"

میکاولی سلسلۂ رشد و ہدایت جاری رکھتے ہوئے اس حکمتِ عملی کے ثمرات کا یوں ذکر کرتا ہے:

"وہ حکمران جو لومڑی کی نقل کرتے ہیں سب سے زیادہ کامیاب رہتے

ہیں یعنی ظاہرداری اور منافقت سے کام لیتے ہوئے اس خصلت کو چھپا رکھنا بھی ضروری ہے؟

میکاولی انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس قدر ظلم و ستم ضروری ہو ایک بار کر ڈالا جائے۔ اس کا اعادہ نفسیاتی اعتبار سے غلط ہے۔

میکاولی کے نظریہ کے مطابق بادشاہ کی طرف سے کسی قسم کی نرمی یا ہمدردی کا اظہار ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب بن سکتا ہے۔ بادشاہ کو قوت و جبروت، شوکت و ثروت اور قہر و جلال کی علامت ہونا چاہیئے۔ میکاولی حصولِ اقتدار کے لیے ہر ذریعے اور ہر حربے کو جائز خیال کرتا ہے۔ مکّاری، عیّاری، ریاکاری اور بددیانتی اس کے ہاں ایسے شمائل خسروانہ ہیں جن کے بغیر کوئی فرد حکمرانی کا اہل نہیں ہو سکتا۔

فشٹے

فشٹے جرمن مفکر ہے، جس نے خودی اور فوق البشر کا تصور پیش کیا۔ وہ خودی اور وجودِ مطلق کو ایک سمجھتا ہے اور ماورائے خودی کسی وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔

فشٹے "طاقت اور" "ارادیت" کو بدرجہ غائت اہم خیال کرتا ہے، اور اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ مردِ آہن اپنی ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادی سے حالات کا رُخ تبدیل کر کے تاریخ سازی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

فشٹے عام معاشرے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اس کے نزدیک عزم و حکومت صرف اُن عظماء کا حق ہے جو باہمت اور صاحبِ عزیمت ہیں۔ اس لیے وہ معاشرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اشراف اور عوام۔ اشراف حاکم ہیں اور عوام محکوم۔

ولیم نطشے

ولیم نطشے کے فکر و فلسفہ کے اثرات مسلّمہ طور پر بڑے وسیع اور دُور رس ہیں۔ عصرِ حاضر کے کچھ مشاہیر واضح طور پر اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔

نطشے زندگی کے تمام مظاہر و تنوعات کو قوتِ ارادی کا کرشمہ مانتا ہے۔ شوپنہار بھی نطشے کی طرح قوتِ ارادی کا قائل ہے لیکن شوپنہار کی ارادیت قنوطیت پر مبنی ہے۔

اور نطشے کی ارادیت رجائیت پر۔ ایک زندگی سے فرار کی راہیں تلاش کرتا ہے اور دوسرا مرکب حیات پر سوار نظر آتا ہے۔

نطشے کہتا ہے کہ:

"خدا کا کوئی وجود نہیں۔ اخلاق، انسان کے ذہن کی تخلیق ہے۔ خیر و شر کا فلسفہ اہلِ مذہب کی اختراع ہے، جو انسانوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا چاہتے ہیں۔"

نطشے عیسایت کی مذمت کرتے نہیں تھکتا اور کہتا ہے کہ دنیا میں مصیبتوں کی اس لیے زیادتی ہے کہ یہاں عیسائیت کثرت سے موجود ہیں، اور غلامانہ اخلاق اور عجز و دناءت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ مزید کہتا ہے:

"عیسائیت ایک مہلک اور پُرفریب جھوٹ ہے، جہاں عیسائیت کا شجر ذلیل ہے، اُس ملک میں اچھی بات کی توقع حماقت ہے۔"

وہ عجز کو گناہ اور قوت کو نیکی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے:

"جو کچھ قوت سے ظاہر ہو وہ سب خیر ہے، اور جو کمزوری سے ظاہر ہو سب شر۔"

نطشے کا عزم الحیات کمزور کی مکمل تباہی اور طاقت ور کی دائمی سربلندی اور ہمہ گیر حکمرانی کا طالب ہے۔ اُس کا فوق البشر (مردِ آہن) انانیت و خودی کا مجسمہ ہے، جو عزمِ محاربت اور عزمِ غلبہ سے سرشار برابر آگے بڑھا جاتا ہے، نطشے کا جوششِ حیات نہ کہیں تھمتا ہے اور نہ کہیں رُکتا ہے۔ نطشے آتش بیان بھی ہے، وہ بڑی گھن گرج کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ انسان مساوی نہیں، اُن میں بعدالمشرقین ہے۔ حکمرانی اور غلبہ صرف فوق البشر انسانوں کا حق ہے۔ وہ بڑی بیباکی کے ساتھ کہتا ہے:

"سب خدا مر چکے ہیں۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ عظیم لوگ زندہ رہیں۔"

وہ بقائے اصلح اور صرف بقائے اصلح کا قائل ہے۔

نطشے لکھتا ہے:

"عورت کا کام جنگجوؤں کو جنم دینا اور پالنا ہے، باقی سب لغو ہے۔"

وہ عوام کو بھیڑوں کا گلہ کہتا ہے۔ جن کو جو چاہے، جہاں چاہے ہانک کرلے جائے۔ بقول نطشے یہ بے مغز ہماری اکثریت میں ہیں اور ان پر مردِ آہن کو پورے جبر واکراہ کے ساتھ حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ نطشے کا فوق البشر خدا کا متبادل ہے۔ جس کی بارگاہ میں عوام پابہ سلاسل و دست بستہ کھڑے ہیں۔ نطشے معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ مردِ آہن (فوق البشر) اور عوام۔

باب ۶

عظماء کی ہلاکت پسندی

حکمرانی کے لیے تشدد کو ناگزیر قرار دینے والوں کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اگر اُن ہستیوں کا مختصر سا حال نہ بیان کیا جائے جنہوں نے ان کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔ ان میں نپولین، مسولینی، ہٹلر، لینن اور اسٹالن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس باب میں نپولین، مسولینی اور ہٹلر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لینن اور اسٹالن کا تذکرہ "لادینیت کی عملی صورت میں" کے باب میں بیان کیا گیا ہے۔

نپولین

نپولین انقلاب کی پیداوار تھا اور اس نے جمہوری اصولوں کی حفاظت کے لیے اسمبلی کے سامنے قسم بھی کھائی تھی۔ لیکن برسرِ اقتدار آنے کے بعد تمام جمہوری اداروں اور قدروں کو پامال کر دیا۔ نپولین کی ذہنی ساخت آمرانہ تھی جیسا کہ ہر اقتدار پرست کی ہوتی ہے۔ وہ رُوسو اور والٹیر کی جمہوریت کے برعکس ڈکٹیٹرشپ کا قائل تھا۔ نپولین، میکاولی اور نطشے کے خیالات کی عملی تعبیر تھا۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کی عظیم ترین شخصیت خیال کرتا تھا اور اہلِ فرانس کو بھی تاثر دیتا تھا۔

درحقیقت نپولین نے چند ایک تبدیلیوں کے ساتھ بادشاہت کو دوبارہ قائم کر دیا تھا۔ ۱۸۰۸ء تک نپولین کے دربار میں لوئیس چہاردہم کے عہد کی شان و شوکت مکمل طور پر لوٹ آئی تھی۔ تختِ شاہی کے گرد نوابوں، امیروں، منصب داروں اور مختلف درجہ کے پادریوں کا ہجوم رہتا تھا۔ پھر وہی شکوہِ خسروانہ تھا اور عوام کی محرومی و بے بسی تھی۔

نپولین نے پوری قوم کو آگ میں دھکیل رکھا تھا۔ گھروں کے گھر بے چراغ ہو گئے تھے۔ جنگ کے میدان، فرانس کے نوجوانوں کی لاشوں سے پٹے پڑے تھے، بے شمار بچے یتیم، بوڑھے، بے سہارا اور عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں۔ ہر طرف گریہ و بکا کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

جب اس نامرادی کے عالم میں نطشے کا ممدوح اور اہلِ فرانس کا فوق البشر شکست کھا کر پیرس پہنچا تو آنکھیں فرشِ راہ کرنے والے عوام اس دن پر لعنتیں بھیج رہے تھے جب اُن سے نپولین کو اقتدار سونپنے کی حماقت سرزد ہوئی تھی۔ نپولین نے اہلِ فرانس کی آنکھوں میں غیض و غضب کے انگارے دیکھے تو ناچار ایک انگریزی جہاز میں پناہ لی۔ انگریزوں نے اُسے گرفتار کر کے بحرِ اوقیانوس کے ایک دُور افتادہ جزیرے میں نظر بند کر دیا۔

مسولینی

مسولینی کی تمام مساعی ملک میں مکمل اجتماعی نظام کے قیام اور فسطائی تنظیم کے استحکام پر مرکوز تھیں۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ اٹلی کی بقا تمام جمہوری اداروں اور اصولوں کی پامالی میں مضمر ہے۔ وہ پارلیمنٹ اور آئین کو ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ خیال کرتا تھا۔ جب وہ پہلی بار بطور ڈکٹیٹر اسمبلی سے ملا تو اُس نے اسمبلی کے اراکین سے انتہائی توہین آمیز سلوک کیا۔ اس نے اُن کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے ذرا سی بھی خود مختاری کا اظہار کیا تو ان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

مسولینی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اُس نے آزادی کی متعفن نعش کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ مسولینی کہتا تھا کہ:

> "فسطائیت کے لیے ریاست، حقیقتِ مطلقہ ہے اور افراد و طبقات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں"

B Mussolini : Fascism, doctrine and Institutions p. 27

مسولینی کا عقیدہ تھا کہ قوت کے ظالمانہ استعمال کے بغیر عوام پر حکومت

نہیں کی جا سکتی ۔ اس کا مشہور قول ہے کہ :

"عوام کی عادت، صنفِ نازک کی عادت سے مشابہ ہے کیونکہ دونوں سختی کو پسند کرتے ہیں ۔"

مسولینی نے اپنی سخت گیر پالیسی سے معاشرے کے تمام شعبوں اور طبقوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور جابر ڈکٹیٹر بن گیا ۔ اس صورتِ حال پر سمر ویلیز Summer Wells. ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے :

"اطالیہ مسولینی کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہے ۔ اس طرح اسے اطالوی زندگی کی تمام سرگرمیوں پر کنڑول حاصل ہو گیا تھا ۔ فسطائیت کے تباہ کن اثرات کے تحت بدعنوان اطالوی معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی ۔ ۱۹۴۰ء تک معاشرتی ڈھانچہ اس قدر متعفن ہو چکا تھا کہ اب کسی ایسے موثر وسیلے کا وجود باقی نہیں رہ گیا تھا، جس کے ذریعے اطالوی عوام کی خواہش ڈکٹیٹر کے مہلک عزائم کا مقابلہ کر سکتی ...... کیونکہ اطالیہ میں بادشاہ سے لے کر وزیروں تک اور جرنیلوں سے لے کر صنعت کاروں تک کوئی بھی اُس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا ۔"[1]

جب خشیتِ ربّی نہ ہو تو حبّ الشہوات غالب آ جاتی ہے اور یہی معبود بن کر رہ جاتی ہے ۔ مناسب حد سے بڑھی ہوئی ہر بھوک تباہ کن ہوتی ہے لیکن اقتدار کی بھوک ایک ایسی آگ ہے جو سب کچھ جلا کر راکھ ہو جاتی ہے ۔ کرسٹو فر ہبرٹ Christopher Hibbert. لکھتا ہے :

"مسولینی کہا کرتا تھا کہ مجھے اقتدار چاہیئے ، یہ آگ مجھے چین نہیں لینے دیتی ۔ جب میں اس ملک کی عنان اپنے ہاتھ میں لوں گا تو تاریخ پر ایسے نشان چھوڑ جاؤں گا ، جیسے شیر اپنے پنجے شکار کی کھال پر چھوڑ جاتا ہے ۔" Christopher Hibbert : Benits Mussolini p39

جنگ کے شعلے ساری دنیا میں بھڑک رہے تھے ۔ محوری طاقتیں شکست پر شکست

---

[1] Summer Welles's Introduction to the Ciano Diaries 1939-43 p. 27.

کھا رہی تھیں۔ مکمل تباہی ان کا مقدر بن چکی تھی، میکاولی اور نطشے کے لبطلِ جلیل مسولینی پر ان مشتعل ہجوم نے ہلّہ بول دیا۔ مسولینی جان بچانے کے لیے ایک ٹرک کے نیچے جا چھپا۔ لوگوں نے مسولینی کو ٹرک کے نیچے سے نکال کر اس طرح ذبح کیا جیسے ایک قصاب بکرے کو۔ قتل کے بعد لاش کو چوک میں اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ آتے جاتے لوگ تھوکتے اور لعنتیں بھیجتے رہے۔ ایک اطالوی خاتون جس کے پانچ بیٹے جنگ میں مارے گئے تھے، شعلہ بار آنکھوں سے آگے بڑھی اور مسولینی کی لاش پر پانچ مرتبہ گولی چلائی اور ہر گولی کے بعد اپنے ایک بیٹے کا نام لے کر پکارتی۔

ہٹلر

ہٹلر میکاولی اور نطشے کے علاوہ کارلائل، آرتھر ڈی گوبی نیو اور ہوسٹن سٹوئرٹ چیمبرلین کے خیالات سے بھی متاثر تھا۔ میکاولی نے ریاکاری اور تشدّد کو قانون کا درجہ دے دیا۔ نطشے نے خدا کی جگہ عظماء کی خدائی کا اعلان کیا، کارلائل نے تمام انسانی تحصیلات و ترقیات کو مشاہیر کی عطا قرار دیا۔ آرتھر ڈی گوبی نیو اور ہوسٹن سٹوئرٹ چیمبرلین نے آریا نسل (جرمن آریا نسل سے ہیں) کی برتری کا قصیدہ پڑھا۔ ہٹلر کا فکری نظام انہی عناصر سے ترکیب پاتا ہے۔

ہٹلر سمجھتا تھا کہ موروثی بادشاہتیں، قانون ساز اسمبلیاں اور مرید یونین جرمنی کی شکست و ذلّت کا موجب ثابت ہوتی ہیں۔ اُس نے تزکِ ہٹلری (Mein Kampe) میں لکھا:

> "ریاست کے لیے بہترین دستور وہ ہے، جو حقیقی تیقن کے ساتھ ملک کے بہترین دماغوں کو کلیدی اسامیوں پہ تعینات کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔"

ہٹلر اپنے بیان میں برابر اضافہ کرتا گیا، اُس نے کہا کہ بنیادی اصول یہ ہے کہ:

> "لیڈر کو اپنے سے نچلوں پر کُلّی اختیار حاصل ہو۔ جو اس کے سامنے پوری طرح جواب دہ ہوں۔"

اس کے بعد ہٹلر نے ایک نہایت ہی اہم اضافہ کیا:

"طاقتور حکمرانی کے لیے پیدا ہوتا ہے اور اُسے کمزوروں سے ملاپ رکھ کر اپنی عظمت قربان نہیں کرنی چاہیئے" (تزکِ ہٹلری)

اقتدار میں آنے کے بعد ہٹلر نے تمام سیاسی تنظیموں اور جمہوری اداروں کو توڑ دیا۔ سیاسی تنظیموں کے فنڈز ضبط کر لیے اور اُن کے لیڈروں میں سے کچھ کو قتل کر دیا، کچھ کو جیلوں میں ٹھونس دیا اور اکثر کو ملک بدر کر دیا۔

ملک میں جگہ جگہ انسانی باڑے کھل گئے۔ جن میں بچوں، عورتوں، بوڑھوں، اور جوانوں کو اذیتیں پہنچائی جاتیں۔ اس خیال سے کہ ستم رانی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے ہٹلر نے باقاعدہ مردم کُشی کی فیکٹریاں قائم کیں اور لوگوں کو تھوک کے حساب سے موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیا۔

ہٹلر نے یہودیوں سے تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائدادیں چھین لیں۔ سوشلسٹوں کے ساتھ بھی ہٹلر نے یہودیوں کا سا سلوک کیا اور اُن کو بھی کچل کر رکھ دیا۔

ہٹلر نے ملک میں جاسوسی کی کئی تنظیمیں قائم کیں جن میں گسٹاپو سرِفہرست ہے۔ یہ بڑی سرگرم اور فعّال تنظیم تھی۔ ہٹلر نے اس کی مدد سے سیاسی میدان میں تمام مخالفت کا قلع قمع کر دیا۔

ہٹلر فنِ تقریر کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اُس کی آواز گرجدار اور ولولہ انگیز تھی۔ وہ عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرتا اور زورِ خطابت سے اُن کو بہالے جاتا۔ وہ اپنی تقریر کے دَوران ایسی طلسماتی فضا پیدا کرتا کہ عوام کو ہٹلر، جرمنی اور جرمنی ہٹلر نظر آنے لگتا۔ وہ سمجھنے لگتے کہ جرمنی کا وجود، اُس کی بقا، اس کا وقار سب ہٹلر ہی کے دم سے ہے۔ وہ مسیحا ہے، مافوق الفطرت ہے اور ناقابلِ تسخیر ہے۔

ہٹلر گرجتی ہوئی آواز میں لوگوں کو بتاتا کہ جرمن قوم دنیا کی قیادت کے لیے پیدا ہوئی ہے اور عنقریب دنیا کے طول و عرض میں جرمنی کی عظمت و نصرت کے پھریرے لہراتے نظر آئیں گے۔ نئی زمین اور نئے آسمان کے وعدے اتنے سحر انگیز تھے کہ قوم مبہوت و مسحّر ہو کر رہ گئی۔

پھر ایک وقت آیا جرمنی ہر محاذ پر شکست کھا گیا۔ اتحادی جرمنی میں داخل ہو گئے

ہٹلر پر ہزیانی کیفیت طاری تھی، اور وہ اس حالت میں اپنی جان نثار قوم، اپنی بہادر فوج اور نامور جرنیلوں کو طرح طرح کی گالیاں سنا رہا تھا۔

قوم کے مسیحا نے خودکشی کی اور جرمنی کو بھی موت کی نیند سلا دیا۔ مقام عبرت ہے کہ دنیا میں انمٹ نشانات چھوڑ جانے کا دعوے کرنے والا آج اس قدر بے نشان ہے کہ کہیں اُس کی قبر کا نشان تک نہیں۔

باب

لادینی فکر و فلسفہ کا تنقیدی جائزہ

اسلام کے سوا کوئی مذہب اپنی اصلی حالت میں نہیں

مادہ پرستوں کے نظریات کو اس درجہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے کہ مذہب پس منظر میں چلا گیا ہے۔ مذہب سے مراد کسی برہمن، پادری، مجتہد یا مولوی کا مذہب نہیں بلکہ وہ تعلیمات ہیں جو تمام روحانی مذاہب کی جان ہیں اور جن کی تتمیم و تکمیل دینِ اسلام پر ہوتی ہے۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی ہے کہ مغرب کے سامنے اسرائیلی اور عیسائی مذاہب ہیں جن میں سے کوئی اپنی اصلی حالت میں ترتیب اور زبان میں کہیں موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، موافق و مخالف، سب اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن میں جن جن آیات اور سورتیں ہیں وہ من وعن وہی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں۔ چنانچہ یہ کہنا سراسر درست ہے کہ اس وقت اسلام کے سوا کوئی بھی مذہب اصلی حالت میں ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اگر عیسائی دنیا اور مادہ پرست آج بھی اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹی ہٹا کر اسلام کا مطالعہ کریں، جس کی تعلیمات اصلی صورت میں موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ سب اسلام کی حقانیت پر ایمان نہ لے آئیں۔ اہلِ مغرب نے کلیسائی نظام اور اس کی جبریت دیکھی ہے، دینِ حق کی جلوہ افروزیوں کا مشاہدہ نہیں کیا، اس کا کیا علاج کہ عیسائیوں کو اسلام سے ازلی بیر ہے۔

جس کا اعتراف اب اہل مغرب خود ہی کرنے لگے ہیں۔ ٹائن بی لکھتا ہے:

"مغرب میں اسلام کی رائج الوقت تحقیر، اسلام کے خلاف عیسائیوں کے تعصب کی پرانی یادگار ہے، جو آج بھی پوری شدت کے ساتھ قائم ہے۔" (ٹائن بی، تاریخ کا مطالعہ جلد ۱۲ صفحہ ۴۷۲)

مذہب اور سائنس میں کوئی تصادم نہیں

ایک اور بات جو غلط فہمی کا شکار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سائنس کو مذہب کا حریف و مدّمقابل قرار دے دیا گیا ہے۔ سائنس کی تحقیقات و انکشافات کا مذہب سے کوئی تصادم نہیں۔ قرآن پاک میں تعقّل و تفکر اور مشاہدے کی بار بار تائید کی گئی ہے۔ اوّل سے آخر تک قرآن پاک کا مطالعہ فرمایئے اور اُن آیات کا شمار کیجیے جن میں حیات و کائنات پر تعمق کی تلقین ہے تو آپ کو ان کی تعداد بڑی کثرت سے ملے گی۔ قرآن پاک فکر کی دعوت بھی دیتا ہے اور تسخیر و تحقیق کا جذبہ بھی ابھارتا ہے۔

قرآن پاک میں بے شمار آیات دریاؤں، ہواؤں، پہاڑوں، بادلوں، ستاروں، اور موسموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ قرآن ان چیزوں کو اللہ کی نشانیاں بتاتا ہے۔ یہاں ان مظاہر کو اللہ کی نشانیاں کہا ہے، وہاں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے ہیں جو سوچتے ہیں اور غور کرتے ہیں۔

رب العزّت نے انسان کو خلیفۃ الارض بنا کر بھیجا ہے۔ یہ کائنات اور اس کائنات کی تمام قوتیں اس کے لیے مسخر ہیں، خدا نے انسان کو علم عطا کیا ہے۔ علم ایک وحدت ہے جو سہولت و تخصص کی خاطر مختلف شعبوں میں منقسم ہے اور سائنس بھی دوسرے شعبوں کی طرح علم کا ایک شعبہ ہے۔

سائنس کی حدود

سائنس کا ایک خاص مزاج ہے، جو حد درجہ سنجیدہ واقع ہوا ہے اور سنجیدگی کسی غیر ثقہ اور غیر مستند امر کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لیے سائنس اپنی مقررہ

حدود کے اندر ہی معقول نظر آتا ہے۔ ان حدود سے تجاوز ائسے اپنے مقام اور مرتبہ سے گرا دیتا ہے۔ کبھی کسی عظیم سائنس دان نے سائنسی استنباط کی قطعیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ سائنس میں ایک گونہ عجز اور جذبۂ اعتراف پایا جاتا ہے اور یہی احساس و جذبہ سائنس کو سرگرمِ جستجو رکھتا ہے۔

سائنس ایسے مفروضات کی بنیاد پر اپنی تحقیقات کا آغاز کرتا ہے جو مسلّمات کا درجہ رکھتے ہیں اور ضروری نہیں کہ یہ مسلّمات لازمی طور پر طبیعی نوعیت کے ہوں۔ اس لیے اس امر کی لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ سائنس حقائق مابعدالطبیعات کو خارج ازامکان قرار نہیں دیتا بلکہ بعض سائنس دان اس موقف کے ہیں کہ سائنس خدا کے وجود کا اثبات کرتا ہے۔

لارڈ کلیون، جو دنیا کے نامور ماہرین طبیعات میں شمار ہوتا ہے، کا مشہور قول ہے کہ:

"آپ جتنا غور و فکر سے کام لیں گے، اتنا ہی سائنس آپ کو خدا کے ماننے پر مجبور کرتا ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ بلند پایہ سائنسدانوں نے کبھی غیر ذمہ دارانہ رویّہ اختیار نہیں کیا۔ "نیم حکیم خطرہ جان اور نیم مُلاّ خطرہ ایمان" مشہور ضرب المثل ہے۔ بنائے فساد یہی لوگ ہیں، جن کی غیر ذمہ دارانہ روش کی بدولت انسانیت کو یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ ان نیم مُلاّؤں کے تصوّرات نے مرکزیت کو ختم کر دیا ہے اور انسان "شترِ بے مہار" کی طرح دشتِ فریب کی بیکرانیوں میں کھو گیا ہے۔ صرف یہی نہیں پوری انسانیت کی وہ تذلیل کی ہے کہ ع

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے

انسان کو حیواں بلکہ بے جان مشین کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں (غالب)

بات تو ان فلسفیوں کی ہو رہی تھی جن کی تیرہ خیالی پوری انسانیت کی تیرہ بختی بن کر رہ گئی ہے۔ انگریز فلسفی فرانسس بیکن نے کہا ہے کہ:

"فلسفے کا سطحی مطالعہ انسان کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے لیکن اس فلسفے کی گہرائی میں اُتریئے تو آپ مذہب کے قائل ہو جائیں گے۔"

قانونِ فطرت

مادیین کہتے ہیں کہ فطرت سراسر مادی ہے اس لیے حیات کے تمام طبقات پر قانونِ فطرت کا اطلاق ہوتا ہے۔ ڈارون اور اس کے ہمنوا قانونِ فطرت سے مراد قانونِ علّیت (علّت و معلول) لیتے ہیں جو تمام احوال و تغیرات کی اساس ہے انسانی اعمال اُس کا منفعلانہ عکس ہے۔ ان کے نزدیک قانونِ فطرت میکانکی ہے۔ اور اپنی کارفرمائی کے لیے کسی بالاتر قوت کا محتاج نہیں۔ اس قانون کی رُو سے خارجی مؤثرات ہی اصل چیز ہیں اور داخلیت یعنی انسانی شعور اور ارادے کی کوئی اہمیت نہیں۔

چنانچہ ان کے نزدیک انسان اور میکانیہ میں کوئی فرق نہیں وہ کہتے ہیں کہ جس طرح مشین اور دوسری اشیاء خارجی عوامل کے تحت کام کرتی ہیں، اسی طرح انسان بھی داخلی تحریک (شعور اور ارادے) کی کارفرمائی کے بغیر محض خارجی عوامل کے تحت کام کرتا رہتا ہے۔

مادہ پرست قانونِ فطرت کی غلط تعبیر کرتے ہیں۔ قانونِ فطرت سلسلہ علّت و معلول کا نام نہیں۔ قانونِ فطرت دراصل اُن مشہود و محسوس احوال و مظاہر کا نام ہے جو ایک ضابطے یا پابند رویّے کے اصول کی وضاحت کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر قانونِ فطرت ایک خاص صورتِ حال کا اظہار ہے جو بذاتہٖ نہ تو سبب ہے اور نہ ہی کسی سبب کی تشریح کرتا ہے۔

داخلیت حیات کی ہر سطح پر پائی جاتی ہے

انسان تو انسان داخلیت حیات کی ہر سطح پر پائی جاتی ہے جس کا ثبوت عملِ انتخاب سے ملتا ہے۔

ہوا کے اجزائے ترکیبی آکسیجن، نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ، بخاراتِ آبی،

امونیا اور نامیاتی ذرات ہیں۔ پودے کی زندگی کے لیے کاربن ڈائی آکسائڈ اور انسان کے لیے آکسیجن لازمی ہے۔ پودا دن کے وقت کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کرتا ہے۔ اور آکسیجن خارج کرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان ہر وقت آکسیجن قبول کرتا ہے اور ہوا کے باقی اجزا مسترد کر دیتا ہے اور پودوں کے لیے کاربن ڈائی آکسائڈ پیدا کرتا ہے۔

ہوا ایک خارجی عامل ہے لیکن پودے اور انسان پر اس کا ردِّ عمل کس قدر مختلف ہے۔ اگر پودے اور انسان میں داخلیت نہ ہوتی تو عمل انتخاب ایک جیسا ہوتا ہے۔

ماہرین حیاتیات بالخصوص جرمنی عالم ڈریش .Driesch مختلف تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جاندار عضویہ اور میکانیہ پر خارجی اثرات کا ردِّ عمل قطعی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ مشین مختلف پرزوں کے سوا کچھ نہیں۔ مشین خارجی عامل کے تحت کام کرتی ہے اور عضویہ داخلی تحریک کی بدولت اپنی مخصوص ہیئت اور جسمانی ساخت برقرار رکھتا ہے۔ عضویہ داخلی تحریک کی بدولت مجموعی طور پر کام کرتا ہے۔ اور اپنی تمام ضروریات پوری کرتا ہے۔ اگر کیکڑہ کی ٹانگ ٹوٹ جائے تو دوسری ٹانگ خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، چھپکلیوں کی بھی یہی صورت ہے۔

"چھپکلیوں کی اکثریت کا یہی حال ہے۔ جب اس کو دشمن پکڑتا ہے تو اُس کی دُم ٹوٹ جاتی ہے .... تمام چھپکلیاں نئی دُم پیدا کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔"

The Illustrated Encyclopaedia of Animal life. p. 1286.

کیکڑے اور چھپکلی کی طرح سمندری جانور نیوٹ (Newt) کا پَیر کاٹ دیا جائے تو تھوڑی دیر بعد نیا پَیر نمودار ہو جاتا ہے۔

فرانسیسی مفکر لیمارک .(Lamarch) داخلی عامل کی یوں تعریف کرتا ہے:

"جب کوئی حیوان اپنے جسم میں نئے عضو کا اضافہ کرتا ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، یا

خواہش کرتا ہے۔ یہ نیا عضو وراثتاً اُس کے بچوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔"

مطلب واضح ہے کہ حیوانات کے عضوی نظام میں بعض اوقات خود بخود نئی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جن کا خارجی ماحول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ تبدیلیاں دراصل داخلی تقاضات کا جواب ہوتی ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ ذی حیات اشیاء میں کوئی نقص یا کمی واقع ہو جائے اور کمی پوری ہو جاتی ہے۔ یہ خصوصیت غیر ذی حیات اشیاء میں نہیں پائی جاتی۔

حیات کا آغاز خلیہ کے ظہور سے ہوتا ہے۔ خلیہ پودوں اور جانوروں دونوں میں پایا جاتا ہے۔ ہر خلیہ ایک حیرت انگیز اور عظیم الشان ساخت کا شاہکار ہے۔ ہر ذی حیات کا وجود متعدد خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ خلیہ کے اندر ایک قسم کی داخلیت پائی جاتی ہے، جو مادی اجسام میں نابید ہے۔ خلیہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ زندگی کا ابتدائی اور بنیادی مادہ (مادۂ حیات) اس میں پایا جاتا ہے جو مسلسل حرکت کرتا رہتا ہے۔ خلیہ کا مرکزہ ہوتا ہے اگر اس کو نکال دیا جائے تو خلیہ کی موت وارد ہو جاتی ہے۔

کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، گندھک اور نائٹروجن وہ بنیادی عناصر ہیں جن کے ملنے سے تمام جاندار بنتے ہیں، لیکن وہ رُوح یا جوہر زندگی، جو خلیہ کو ایک سے دو یا دو سے چار وغیرہ میں تقسیم کرتا رہتا ہے، کہاں سے آگیا۔ ان عناصر ترکیبی میں تو اُس کا سُراغ نہیں ملتا۔

اس مقام پر خارجی عمل اور قانون علیت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے البتہ ایک ایسے نظم کا یقین ہوتا ہے جو ایک بزرگ و برتر ہستی کی تخلیق ہے۔

مقام حیرت ہے کہ خلیہ اپنا مثل پیدا کرتا ہے۔ یہ مثل پھر اپنا مثل پیدا کرتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور کہیں ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ انسان نے خدا کو بنا کر حیرت انگیز تولیدی قوت بھی رکھ دی کہ روز ازل سے بے شمار انسان پیدا ہوتے چلے آتے ہیں اور پھر یہ تمام انسان بنیادی خصوصیات میں مساوی ہوتے ہوئے اپنی الگ انفرادی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ توالد و تناسل کی عجیب و غریب

بے پناہ قوت وجودِ باری تعالیٰ کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ کسی اور دلیل یا ثبوت کی حاجت نہیں رہتی ۔ یہاں نہ کسی علّت کا سُراغ ملتا ہے اور نہ خارجی عوامل کا تجزیہ کام دیتا ہے اور نہ انسانی فکر وفہم کی جولانیاں عقدہ کشا ثابت ہوتی ہیں ۔

جب ہم انسان کے نفسی کوائف کا تجزیہ کرتے ہیں تو ایک نئی دنیا جلوہ فرما نظر آتی ہے ۔ انسانی سطح پر آزاد ارادے اور شعور کے بے حد وحساب تضادات پائے جاتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک ہی عمل کا ردِّعمل مختلف انسانوں پر کس درجہ مختلف ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حالات وواقعات کے پس منظر یا تناظر میں انسانی رویّے اور کردار کے متعلق پیشگوئی نہیں کی جا سکتی ۔

مثال کے طور پر بدلے ہوئے رویّے کا مختلف اشخاص پر مختلف ردِّعمل ہوتا ہے ۔ کوئی فوری طور پر اس بدلے ہوئے رویّے کے خلاف احتجاج کرتا ہے ، کوئی خاموش رہتا ہے اور مناسب وقت کا انتظار کرتا ہے ۔ کوئی اسے اہمیت نہیں دیتا اور بھول جاتا ہے اور کوئی ہمیشہ کے لیے وجہ اختلاف بنا لیتا ہے ۔ گاہے گاہے مُدتوں کا جسمانی قرب ، ذہنی بعد کو ختم نہیں کرتا اور بُعد ہی رہتا ہے ۔ گاہے ایک لمحہ کا قرب سارے فاصلے ختم کر دیتا ہے اور قرب ہی قرب رہ جاتا ہے ۔

ایک انسان دوسرے انسان سے کس قدر مختلف ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ۔ ایک خون بہا کر خوش ہوتا ہے ، دوسرا کسی کو ملول دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے ، ایک کو مصائب دبا دیتے ہیں ، دوسرے کو اُبھار دیتے ہیں ، ایک کے لیے اشارہ کافی ہے ، دوسرے کے لیے تفصیل بھی بے اثر ہے ۔ ایک شہرت کے لیے سب کچھ قربان کر دیتا ہے ، دوسرا حقیر فائدے کے لیے عزت لٹا دیتا ہے ۔ ایک چراغِ نیم شبی کی روشنی میں جگر خون کرتا ہے ، دوسرا خوابِ گراں کے مزے لیتا ہے ۔ ایک قوم وملت پر جان دیتا ہے ، دوسرا ملت فروش ہے ۔ ہر انسان اپنی ذات میں ایک کائنات ہے ۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

انسان خود علّت الفعل ہے ، تابع علّت نہیں ۔ خالق عوامل ہے ، معمول نہیں ۔ تاریخ ساز

ہے تاریخ کا نتیجہ نہیں۔

رائیڈ مارگن پروفیسر علم الحیات نے مسئلہ ارتقاء کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اپنی تحقیق کے نتائج ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"جو حاصلات یہاں کام کر رہی ہیں اُن کی توضیح اس اعتبار سے تو کر سکتے ہیں کہ انہیں موجودہ احوال وظروف کا نتیجہ قرار دیں۔ لیکن ارتقائی تقاضا کا فجائی ظہور جس طرح ابھرتا ہے، شلاً زندگی کی نمود، ذہن و ادراک کی جلوہ طرازی، ذہنی شخصیت اور معنوی انفرادیت کا ڈھلاؤ۔ اس کی توضیح بغیر اس کے نہیں کی جا سکتی کہ ایک [illegible] قوت کی کارفرمائی یہاں تسلیم کر لی جائے۔"

(ماخوذ فلسفہ: ابوالکلام آزاد)

زندگی حادثہ کی پیداوار نہیں

النظام ایک عظیم معتزلہ مفکر نے جس کا انتقال ۸۴۵ء میں ہوا۔ یہ نظریہ پیش کیا کہ تخلیق اتفاقی نہیں بلکہ خدا کے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ ہے۔

زندگی نہ تو عملِ ارتقاء کی آخری کڑی ہے اور نہ ہی کسی اتفاق و حادثہ کی پیداوار ہے۔ یہ خدا کے براہِ راست تخلیقی عمل کا شاہکار ہے۔ پروفیسر ایڈون ماہر حیاتیات پرسٹن یونیورسٹی نے اکثر کہا ہے کہ:

"زندگی کا بطور حادثہ وقوع پذیر ہونا ایسے ہی ہے جیسے ایک مطبع میں دھماکے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہونا۔"

ہماری یہ کامیاب خلائی پروازیں، یہ چاند کی سیر، دوسرے سیاروں پر پہنچنے کے منصوبے اس حقیقت کے اعتراف پر مبنی ہیں کہ کائنات بطور اتفاق و حادثہ وجود میں نہیں آ گئی، بلکہ منصوبہ بندی کا کرشمہ ہے۔ ہم نے اُن ذرات کا مشاہدہ کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں کیا، جن کے ملنے سے ایک سالمہ بنتا ہے لیکن ایٹم بم کی ایجاد نے ہمارے نظریات کو درست ثابت کر دیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ کائنات کے مختلف عناصر، طبقات اور اجسام میں ہم آہنگی اور تعامل ہے۔ اس سے بڑھ کر حسن ہے اور جامعیت ہے۔ اس

سے بھی بڑھ کر مرکزیت ہے:

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ۔

(ترجمہ) تو خدا کی آفرینش میں کوئی اختلاف نہیں دیکھے گا۔ پھر آنکھ اٹھا کر دیکھ کیا تو کوئی بگاڑ دیکھتا ہے۔ پھر آنکھ اٹھا کر اور بار بار دیکھ، تیری نظر حیرت سے تھک کر واپس لوٹ آئے گی۔

(پارہ ۲۹، سورت ۶۷، آیت ۴)

اس آیت میں تفاوت اور فطور دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں جو قابل غور ہیں۔ تفاوت کے معنی اختلاف اور فطور کے معنی اختلال ہیں۔ اب معنی واضح ہیں فرمایا تم اس مخلوق میں تفاوت نہیں پاؤ گے۔ یعنی ایسا نہیں کہ ایک جگہ ایک قانون کام کر رہا ہے تو دوسری جگہ مخالف قانون کام کر رہا ہے۔ خدا کا قانون بے عیب ہے اور اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور تمام مخلوق پر ایک ہی قانون جاری ہے۔ سائنس بھی آج یہی بتاتا ہے کہ ایک ذرّے سے لے کر سیاروں اور ستاروں تک ایک ہی قانون کام کر رہا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو تسخیر کائنات کے منصوبے کس بنا پر تیار کیے جاتے ہیں؟ پھر یہ کہ اس کی کائنات میں کوئی فطور (خلل) نہیں۔ خدا کی آفرینش ہر اعتبار سے مکمل ہے اور اس کی بنائی ہوئی ہر چیز حسین ہے اور جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اس کے لیے موزوں ترین ہے۔

فلسفی اب کائنات کی غیر مادی تعبیر کرنے لگے ہیں

مدتوں فلسفی کائنات کے کل احوال ومظاہر کی توجیہہ محض مادہ کے قوانینِ حرکت سے کرتے رہے وہ اس خالص مادی توجیہہ کے علاوہ کسی اور توجیہہ کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ امتدادِ وقت کے ساتھ فلسفیوں نے محسوس کیا کہ کائنات کی مادی تعبیر سے کام نہیں چلتا اور وہ ذہن، شعور، آفاقی ذہن اور خدا کا ذکر کرنے لگے۔

جے۔ اے ٹرنر ذہن کی موجودگی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"یہ حقیقت کہ فطرت ایک ترقی پذیر مشین ہے۔ واضح اور قطعی طور پر ذہن کے عمل کی نشاندہی کرتی ہے، ایسا ذہن جو کل پر محیط ہے۔"

J.E. Turner : Personality & Reality. p. 156.

ایف۔ آر ٹیننٹ کہتا ہے کہ:

"اگر فطرت میں ربط وہم آہنگی کے کثیر التعداد شواہد اور منصوبے دانائی پر بردلالت کرتے ہیں تو پھر یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ دانشمندانہ تنظیم خدا کا کام ہے یا فطرت کا۔ کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ فطرت ترتیب پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔"

F.R. Yennant : Theological studies October 1929.

پروفیسر جوڈ (Jodal) کہتا ہے:

"اُن تمام فیصلوں پر جو ہم نے مذہب اور خدا کی ہستی کے بارے میں کیے تھے از سرِ نو غور کرنا چاہیئے۔ ہم عقل کا سہارا لیتے ہیں لیکن ہمیں کوئی حل نہیں ملتا۔"

(ماخوذ از فلسفہ، ابوالکلام آزاد)

ٹامسن جی لکھتا ہے:

"درحقیقت انسان مشاہدے کی دنیا میں تنہا وارد نہیں ہوتا بلکہ

اپنے ساتھ ایک روحانی قوت کے وجود کا احساس لاتا ہے جو اس سے بلند تر ہے۔"

ٹائن بی : تاریخ کا مطالعہ جلد ۱۲ صفحہ ٦٨

Jaynlee : A study of Histary Vol. XII. p. 68,

جرمن فلسفی دہل (Reihl). ٹائن بی کے خیالات کی تائید ان الفاظ میں کرتا ہے :

"انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا، جب تک کوئی ایسی چیز اُس کے سامنے موجود نہ ہو، جو اُس سے بلند تر ہے وہ کسی چیز کو دیکھنے کے لیے ہی سر اوپر کر سکتا ہے۔"

(ماخوذ از فلسفہ / ابوالکلام آزاد)

ڈائس تو یہ کہتا ہے کہ انسان ابتدا ہی سے ما فوق الفطرت کی پرستش کرتا رہا ہے :

"ابتدائی مظاہر پرستی کے دور میں بھی فطرت کی پرستش، فطرت کو بذاتہٖ معبود سمجھ کر نہیں کی جاتی تھی، بلکہ عبادت ہمیشہ ما فوق الفطرت کی مقصود ہوتی تھی، جس کو مبہم طور پر تمام فطرت میں موجود اور کار فرما محسوس کیا جاتا ہے۔"

Danson : The Dynamics of the world History. p. 173.

سائنس کے جدید نظریات مذہبی عقائد کی توثیق کرتے ہیں

انیسویں صدی تک سائنسدان بھی فلسفیوں کی طرح کائنات کو کلیتہً مادی خیال کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مادہ ازلی ہے اور ابدی ہے اور اس کسی قسم کی کمی و بیشی ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ وہ صرف تجربے اور مشاہدے کو صداقت کا معیار قرار دیتے تھے۔

یہاں یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ مسلمان فلسفیوں نے جزو لا یتجزیٰ اور خلا کا اعتراف کیا ہے لیکن مادّے کی ازلیت اور زندگی کے بطور حادثہ پیدا ہونے کے نظریئے کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔

سائنس کی جدید تحقیقات انقلاب آفرین ثابت ہوتی ہیں، پرانے نظریات کی بساط اُلٹ گئی ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سائنسدان بھی کائنات کی خالص مادّی تعبیر کی دلدل سے نکل کر ذہن، شعور، آفاقی ذہن اور خدا کے وجود کا اقرار کرنے لگے ہیں۔

سر جیمز جینز لکھتا ہے:

"علم طبیعات کے جدید تصورات کے مطابق کائنات کی کوئی مادّی توجیہ ممکن نہیں۔ اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ کائنات کا سارا معاملہ ہی اب تخیلاتی معاملہ بن گیا ہے۔"

Sir a mes Jeans. The Mysteries of Universe p. 123.

سر جیمز جینز ایک اور مقام پر اس خیال کو یوں بیان کرتا ہے:

"ہماری کائنات ایک بڑی مشین کے مقابلے میں ایک عظیم خیال سے زیادہ مشابہ ہے۔ میں یہ بات ایک سائنسی حقیقت کی طرح نہیں بلکہ گمان کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ کائنات کسی بڑے آفاقی ذہن کی پیداوار ہے جو ہمارے ذہنوں سے مطابقت رکھتا ہے اور سائنس کے تصورات بھی اب اسی طرح اقدام کرتے نظر آتے ہیں۔"

بقول سر جیمز جینز:

"سائنس اب اس موقف میں ہے کہ کائنات نہ ازلی ہے نہ ابدی، مادّہ قدیم نہیں حادث ہے اور فنا ہوتا ہے۔ کائنات کا آغاز ہے اور انجام ہے اور یہ کائنات ارتقاء کے تدریجی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ تخلیق کا کرشمہ ہے۔"

جوہری توانائی، قانونِ حرکیاتِ حرارت، نظریۂ مقادیر اور نظریۂ اضافت

نے قدیم تصورات کو باطل ثابت کر دیا ہے۔

کائنات کی تخلیق

کائنات ازلی نہیں۔ الفر (Alpher) اور گیمو (Gamow). کے نظریات کے مطابق یہ کائنات آنِ واحد میں تخلیقی دھماکے کے ذریعے وجود میں آئی تھی۔ اس تخلیقی انفجار (Explosion). کے وقت درجۂ حرارت ایک ارب کے لگ بھگ تھا۔ اس دھماکے کے واقع ہوتے ہی تمام کیمیائی عناصر پیدا ہو گئے جن سے بعد میں نظامہائے فلکی کی تشکیل عمل میں آئی۔

کائنات کا آغاز ہے اور انجام ہے

علم کیمیا کے جدید تصورات کی رُو سے مادہ بتدریج فنا ہو رہا ہے۔ اس کی بعض انواع کے فنا ہونے کی رفتار انتہائی سست ہے اور بعض کی انتہائی تیز۔ مادے کی اس صورتِ حال سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ مادہ اپنی ذات میں نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ دوسرے یہ کہ اس کا ایک نقطۂ آغاز ہے اور نقطۂ انجام بھی۔

حرکیاتِ حرارت Thermodynamics. کے قوانین کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ کائنات بتدریج فنا کی طرف بڑھ رہی ہے اور ایک وقت آنے والا ہے جب حرارت و توانائی ختم ہو جائے گی اور زندگی کے تمام ہنگامے ختم ہو جائیں گے۔ حرکیاتِ حرارت کا قانون ۔ ضابطۂ ناکارگی (Law of Enthropy) اس حقیقت کی یوں وضاحت کرتا ہے کہ:

> "حرارت ہمیشہ باحرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہو رہی ہے۔ اس لیے ایک وقت آنے والا ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور مکمل ناکارگی کا ظہور ہوگا: ہر طرف جمود طاری ہو جائے گا۔ طبیعاتی اور کیمیاوی عمل ختم ہو جائے گا اور زندگی نابید ہو جائے گی۔"

یہ عمل ناکارگی اس حقیقت کی بھی ہمہ جہت تصدیق کرتا ہے کہ کائنات ازلی نہیں کیونکہ اگر اس کا وجود ازلی ہوتا تو ناکارگی کی بدولت اس کی حرارت کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی اور یہاں زندگی کی ایک انتق بھی باقی نہ رہتی۔

سائنس کے تمام نظریات غیر ارادی طور پر یکسن واشگاف انداز میں مذہبی عقائد کی توثیق کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں پروفیسر پلانک اور آئزن برگ کے نظریہ مقادیر عنصری نے سائنس میں تاریخ ساز انقلاب برپا کیا۔ ان نظریات نے سائنس، فلسفہ اور نفسیات سب کو یکساں طور پر متاثر کیا ہے۔

پروفیسر پلانک، ہائزن برگ، اڈنگٹن اور آئن شٹائن انسان کو بارادہ اور باشعور ہستی قرار دیتے ہیں اور یہ عظیم سائنسدان حقیقت کو مادی الاصل نہیں ذہنی الاصل بلکہ ایک خدا کی تخلیق مانتے ہیں۔ پروفیسر پلانک کہتا ہے:

"شعور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق مادہ شعور سے ماخوذ ہے۔ ہم شعور سے الگ نہیں ہو سکتے اور ہر وہ چیز جس کا ذکر ہم کرتے ہیں اور ہر وہ چیز جس کے وجود کا ہمیں یقین ہے، شعور کی مقتضی ہے۔"

البرٹ آئن شٹائن وجود باری تعالیٰ کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"یہ ایک لامحدود اور اعلیٰ ترین قوت و علت ہے۔ جس کے مظاہر اس ناقابلِ فہم کائنات میں ہر جگہ نظر آتے ہیں اور یہی وہ طاقت ہے جس کو میں خدا کہتا ہوں۔"

باب ۸

اشتراکیت لادینیت کی عملی صورت ہے

اشتراکیت کا مذہبی اور تاریخی پس منظر

مارکس کا "سرمایہ"

مارکس نے سوشلزم کا تانا بانا، تاریخی واقعات اور فلسفیانہ تصورات کی ترتیب و ترکیب سے تیار کیا ہے۔ مارکس نے اپنے خیالات کو نہایت منضبط انداز میں پیش کیا ہے مارکس کی تصنیف "سرمایہ" زندگی کے خون سے لکھی ہوئی تحریر ہے۔ جس میں مارکس کے اپنے خون کے علاوہ اس کے بچوں کا خون بھی شامل ہے۔ "سرمایہ" مارکس کا وہ راس المال ہے جس کی خاطر اس نے ہر قسم کی قربانی بطیب خاطر قبول کی۔ مارکس کہتا ہے:

> "میں نے اس کتاب پر اپنی صحت، اپنی خوشی اور اپنے بال بچوں کو قربان کر دیا ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ مارکس نے علالت، تنگدستی، فاقہ کشی، بیوی بچوں کی خستہ حالی سب سے بے نیاز ہو کر بیماری کے عالم میں زندگی کے آخری لمحات تک جگر خون کیا اور سرمایہ کی تخلیق کی ہے۔ ؎

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم (اقبال)

عشق و مستی کا اپنا رنگ اور اپنا مقام ہے۔ انہماکِ شوق کی مستیوں کو کچھ اہل جنون ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کیا آپ اُس عاشقِ جانباز کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے

جورات کی تاریکیوں میں رسوائیوں کو دعوت دیتا، خطرات کو پکارتا، قبائے ننگ و ناموس چاک کرتا، سر ہتھیلی پر رکھے بے تابانہ بارگاہِ محبوب کی طرف اڑا جاتا ہے ؎

واہ رے شوقِ شہادت کوئے جاناں کی طرف
گنگناتا، رقص کرتا، جھومتا جاتا ہوں میں

عقیدے اور عمل کا تضاد

ادعائے عشق عملی ثبوت چاہتا ہے اور عملی ثبوت خلوص کی پیداوار ہے۔ اگر عشقِ حقیقی کے دعوے داروں (مذہبی پیشواؤں) میں اخلاص کی ایک رمق بھی باقی رہ گئی ہوتی تو مارکس مادیت کے بت بے جان کی پرستش کرانے میں کامیاب نہ ہو سکتا۔

عقیدہ اور عمل غیر منفصل ہیں۔ عقیدے اور عمل کے تضاد کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ دیکھنے والے کا ایمان عقیدے کی صداقت سے اُٹھ جاتا ہے۔ عام آدمی کا مذموم عمل، قابلِ مذمت ہوتے ہوئے بھی اپنے اثرات کے اعتبار سے غیر محدود نہیں۔ لیکن حضرت شیخ کا عمل اپنے اثرات کے اعتبار سے غیر محدود ہے۔

مقامِ امامت، حفظِ مقام بلکہ تقدیس مقام کے لیے عملِ صالح اور خلوصِ بے پایاں کا مطالبہ کرتا ہے۔ منافقت کی خفیف سی جھلک، مصلحت کی خفیف سی رمق، منفعت کی حقیر سی طلب اس مقامِ جلیلہ کی عظمت و حرمت خاک میں ملا دیتی ہے اور سارا ماحول گرد آلود ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس گرد آلود ماحول میں تشکک پرورش پاتا ہے جو بڑھ کر الحاد و کفر کی عملی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ نے توحیدِ باری تعالیٰ اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی تھی۔ بددیانت مفاد پرستوں نے حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات کو مسخ کر دیا۔ اب جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی اُسے پوپ کے کلیسائی نظام نے پورا کر دیا۔

سوشلزم کا ماضی بھی ہے اور حال بھی۔ ماضی چند ایک عوامل پر مشتمل ہے جن کا تجزیہ ضروری ہے۔

عیسائیت کا عروج اور پاپائیت

۳۱۲ء میں قیصرِ روم، قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور عیسائیت کو سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ قسطنطین اعظم کی کوششوں سے عیسائی مذہب کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور دنیا بھر کے عیسائی اس سلطنت کو اپنا مرکز خیال کرنے لگے اور روم پاپائے اعظم کا ہر جگہ ڈنکا بجنے لگا۔

جسٹینین اوّل نے (۵۲۷ - ۵۶۸) نے قسطنطنیہ پر ایک بہت بڑا گرجا تعمیر کیا اور ایک درس گاہ قائم کی، جس میں عیسائیت کی تعلیم دی جانے لگی۔ ایتھنز کے تمام تعلیمی ادارے جن میں یونانی حکما کی فلسفے کی تعلیم دی جاتی تھی بند کر دیے گئے۔

شمال مشرق کی وحشی اقوام گاتھ اور وینڈال کے مسلسل حملوں نے روم کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ یورپ میں متعدد بادشاہیاں اور جاگیرداریاں قائم ہوئیں۔ انگلستان، جرمنی اور ڈنمارک میں اینگلوسیکسن، فرانس میں فرینک اور اٹلی میں لومبارڈ اپنا اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تمام یورپی ممالک میں عیسائیت بدستور قائم رہی اور پوپ کا اقتدار برابر مسلط رہا۔

گبن کا کہنا ہے کہ عیسائیت کی ہمہ گیر اشاعت سے جہالت کی تاریکیاں چھا گئیں، جو کم و بیش آٹھ صدیوں تک قائم رہیں۔ عیسائیت نے علم و فکر کی تمام راہیں مسدود کر دیں اور تحصیل علم صرف مذہبی تاویلات تک محدود ہو کر رہ گئی۔ کسی کو حیات و کائنات پر تحقیق کی اجازت نہ تھی۔ کوپرنیکس اور گیلیلیو کی کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ گیلیلیو کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ گھنٹوں پادریوں کی ایک کونسل کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا رہا اور اس حالت میں اس کو یہ کہنے پر مجبور کیا گیا کہ زمین متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے۔ اس طرح گیلیلیو موت سے بال بال بچا۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔

کلیسا کی ہمہ جہت گرفت اور بدعات

تمام عیسائی دنیا، رعایا اور حکمران پاپائے روم کو دینی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ پوپ نے اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے پادریوں کی ایک تنظیم قائم کر رکھی تھی، جو

معاشرے کے تمام شعبوں میں حکمران تھی بچے کے بپتسمہ کی رسم ہو کہ سن شعور کو پہنچنے پر اس کی تعلیم کا آغاز، شادی بیاہ ہو کہ میت کی تدفین، کوئی رسم پادری کے بغیر سرانجام نہ پا سکتی تھی۔ یہاں تک کہ عالمِ نزع میں پادری موجود ہوتا تھا اور مرنے والے کے سر پر تیل کی مالش کرتا تھا۔ پادریوں کے آرے نیارے تھے۔ وہ ان رسومات کی بجاآوری کے عوض بھاری رقوم وصول کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پوپ ہر سال ایک خطیر رقم بطورِ خراج وصول کرتا تھا۔ جس کا بوجھ عوام کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

معافی نامے عام اشیائے صرف کی طرح کھلے بازار میں بکتے تھے۔ جب کبھی پوپ کو روپے کی ضرورت پڑتی تو معافی ناموں کی خرید لازمی قرار دے دی جاتی۔ پادری اس غرض سے باقاعدہ دورے کرتے تھے اور معافی نامے بالجبر فروخت کرتے پھرتے تھے۔

پاپائے اعظم نے مذہبی اقتدار کی بدولت سیاست و معیشت پر مکمل قبضہ جما لیا ہوا تھا۔ ان حالات میں عوام کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ ان بیچاروں کو پوپ بھی لوٹتا تھا اور بادشاہ بھی۔ درا صل پوپ اور بادشاہ چکی کے دو پاٹ تھے، جن میں عوام بُری طرح پس رہے تھے۔ ابتدا میں پادری محتاط تھے لیکن جب دولت کی ریل پیل ہوئی تو عیش و عشرت میں کھو گئے۔ عوام دستور کے مطابق اُن کے مت لبق اُن کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے لیکن خود پادری مجسمۂ گناہ تھے۔ جب اقتدار اور دولت ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو انسانیت رخصت ہو جاتی ہے۔

یورپ میں فرقہ وارانہ کشمکش

ہر چیز ایک حد تک قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ جب خداوندانِ کلیسا کی زیادتیوں کی کوئی حد نہ رہی تو لوگ حکم عدولی پر اتر آئے۔ اس حکم عدولی کی ابتدا پادریوں سے ہوئی۔

آکسفورڈ کے ایک پادری وائیکلف نے پاپائے اعظم کے جابرانہ نظام

کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ کہتا تھا کہ پوپ کے احکام کی بجا آوری ضروری نہیں
اور انسان کو صرف اپنی ضمیر کی آواز پر عمل کرنا چاہیئے۔ جرمن پادری جان
ہیسس، لوپ اُسس کا ہم نوالہ بن گیا۔ بھلا اس گستاخی کو کیونکر برداشت کر سکتا
تھا۔ پوپ نے جان ہیسس کو اپنے خیالات تبدیل کرنے کا حکم دیا، لیکن ہیسس
نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اب کیا تھا پوپ کی آتشِ غضب بھڑک اُٹھی
اور پوپ کے حکم کی تعمیل میں جان ہیسس کو زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ اور وائیکلف
کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نذرِ آتش کر دی گئیں۔

مارٹن لوتھر جرمنی کے شہر "وٹن برگ" میں دینیات کا پروفیسر تھا۔ اُس نے
پوپ کے خلاف متعدد مضامین شائع کئے۔ اس کی تحریر و تقریر میں بڑا
زور تھا۔ اُس نے کلیسائی نظام کی خوب مذمت کی اور ثابت کیا کہ معافی ناموں کی
فروخت اور رہبانیت، سب فریب ہے۔ لوتھر کی تحریکِ اصلاح کا یہ نتیجہ نکلا کہ
ساری دنیا دو متحارب فرقوں میں بٹ گئی۔ یہ دو فرقے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ تھے
کیتھولک پوپ کے حامی تھے اور مروّجہ کلیسائی نظام کے حق میں تھے۔ پروٹسٹنٹ
مروّجہ کلیسائی نظام کے خلاف تھے اور پوپ کے اقتدار کا خاتمہ چاہتے تھے۔ وہ
عیسائی مذہب کو غلط رسومات اور دیگر خرافات سے پاک کرنا چاہتے تھے۔

انقلاب فرانس تک یورپ کی ساری تاریخ ان دو متحارب فرقوں (پروٹسٹنٹ
اور کیتھولک) کی باہمی کش مکش اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کے نمایاں
اسباب اپنی نوعیت میں مذہبی تھے۔

ملکہ میری جو کیتھولک تھی اور انگلستان میں کیتھولک مذہب کو مکمل طور پر رائج
کرنا چاہتی تھی۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی کئی ایک معزول شدہ کیتھولک پادریوں
کو دوبارہ اپنے عہدوں پر بحال کر دیا اور ان پروٹسٹنٹ پادریوں کو جیلوں میں
ٹھونس دیا، جن کا تقرر اُن کیتھولک پادریوں کی جگہ عمل میں آیا تھا۔ ان پروٹسٹنٹ
پادریوں میں، جن کو قید کیا گیا تھا، کرینمر لیٹیمر
اور رڈلے بھی شامل تھے۔

ہم دو دار کے انتقام کو مدعیری نے نہایت خند یک قدم اٹھایا۔

اس نے پارلیمنٹ سے منظوری لے کر، اُن تمام پرانے قوانین کو دوبارہ نافذ کر دیا، جن کی رُو سے غیر کیتھولک عقائد پر عمل کرنے والوں کو زندہ جلا دینے کا اختیار حاصل تھا۔ میری نے کیتھولک پادریوں کو حکم دیا کہ اُن پادریوں اور لوگوں کا پتہ لگائیں، جو کیتھولک عقیدے سے منحرف ہو چکے تھے۔ میری کا خیال تھا کہ نامور پروٹسٹنٹ لیڈروں کی تعذیب سے مطلوبہ نتائج فوری طور پر برآمد ہو سکیں گے۔ اس لیے میری نے کینن روجر (Canon Rogers). اور بشپ ہوپر (Bishop Hooper) کو علی الترتیب لندن اور گلوسٹر میں مجمع عام کے سامنے زندہ جلا کر راکھ کر دیا۔ میری کا خیال تھا کہ بربریت کا یہ زہرہ گداز منظر اکثر پروٹسٹنٹوں کو راہِ راست پر لے آئے گا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور لوگ ثابت قدمی سے پروٹسٹنٹ عقیدے پر ڈٹے رہے۔

میری نے مشقِ ستم جاری رکھتے ہوئے کریمر (Cranmer) سے کہا کہ وہ لوگوں کے سامنے برملا کیتھولک ہونے کا اعلان کرے۔ جب اُس کو مقتل کی طرف لے جایا گیا تو اُس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا کہ وہ پکا پروٹسٹنٹ ہے۔ کریمر کو ٹکٹکی پر چڑھا کر آگ لگا دی گئی۔ جس سکون و ثبات کے ساتھ کریمر نے اپنے عقیدے کی خاطر جان قربان کی وہ قابلِ تعریف ہے۔

اگلے تین سالوں میں میری نے تین سو افراد کو جن میں جوان، بوڑھے، مرد اور عورتیں تھیں زندہ جلا کر راکھ کر دیا۔

اسپین کے ہوجونانس Huguenots.

اسپین کے پروٹسٹنٹوں کو ہوجونانس Huguenots. کے نام سے پکارا جاتا جاتا تھا۔ یہ لوگ ہمیشہ ظلم کی چکی میں پستے رہے۔ ان ہوجونانس نے بڑی دقتوں سے "قانونِ رواداری" پاس کرایا تھا۔ دربارِ شاہی میں کیتھولک پادریوں کا تحفظ تھا۔ انہوں نے بادشاہ پر دباؤ ڈال کر "قانونِ رواداری" منسوخ کرا لیا۔ اس کا بیشتر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خوفناک جنگ چھڑ گئی، جو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے تیس سال تک جاری رہی۔

ملکہ الزبتھ ۱۵۵۸ء میں تخت نشین ہوئی۔ اس وقت تک پوپ کا وقار بہت حد

تک مجروح ہو چکا تھا اور یورپ کے بہت سے ممالک پوپ کے اثر سے آزاد ہو چکے تھے۔ فلپ شاہ اسپین پوپ کا دستِ راست تھا اور کیتھولک مذہب کا احیاء اپنا مقدس فرض خیال کرتا تھا۔ فلپ ملکۂ الزبتھ کو ملحد خیال کرتا تھا۔ اس لیے اُس نے ملکۂ الزبتھ کو سزا دینے کے لیے ایک بہت بڑا جنگی بیڑا تیار کیا اور انگلستان پر حملہ کر دیا۔ ان دنوں، چونکہ انگلستان کی بحری طاقت بڑی مضبوط تھی اس لیے فلپ دکٹوریہ کو سزا دینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

یورپ میں مذہب کے نام پر انسانیت کشی کی داستان اتنی دردانگیز، اور شرمناک ہے کہ اس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ دور پرفتن تھا اور اس میں مذہبی اختلاف کی بنا پر زندہ جلا دینا ایک عام بات۔

تحریک اصلاحِ کلیسا

تحریک اصلاحِ کلیسا خدا اور مذہب پر یقین و اعتماد بحال کر کے اُس خلاء کو تو پُر نہ کر سکی جو پاپائیت کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ البتہ اس تحریک کی بدولت انسانی موج پر سے پہرے اُٹھ گئے اور لوگ مذہب، سیاست، معیشت اور طرزِ حکومت ایسے موضوعات پر آزادانہ اپنی آراء و افکار کا اظہار کرنے لگے۔

مادہ پرستی کی وہ تحریک جس کا آغاز دیما قریطس اور ایپکورس کے تصوّرات سے ہوا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں چرچ کی بالادستی کی وجہ سے رُکی رہی۔ جونہی تحریکِ اصلاح کلیسا کے زیرِ اثر حریتِ فکر کا دَور شروع ہوا۔ یہ تحریک دوبارہ شروع ہو گئی۔

حریّت پسندی

آزادیٔ فکر کی تحریک اٹھارہویں صدی میں شروع ہوئی اور انیسویں صدی میں نقطۂ کمال کو پہنچ گئی۔ اس تحریک کو "خرد افروزی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کے نمائندے ہر ملک میں موجود تھے لیکن فرانس کو اس معاملہ میں امتیازی مقام حاصل تھا۔

فرانس میں والٹیئر (Voltan مانٹسکو (Montasquiew) رُوسو (Rosseaw) انگلستان میں ہیوم Hume) گبن (Gibbon) اور رابرٹ سن (Robertson) جرمنی میں لیسنگ (Lessing) گوئٹے (Gothe) شلر (Shiller) اور کینٹ (KANT) اس تحریک کے قائد تھے۔

والٹیئر

والٹیئر اپنی علمی قابلیت اور شہرت کی بنا پر ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کا مزاج تیر و نشتر سے بھرپور ہے۔ جب وہ اہلِ کلیسا کی ریاکاری پر حملہ آور ہوتا ہے تو اُس کے تیر بڑے تند اور نشتر بڑے تیز ہوتے ہیں۔ جب وہ جھوٹی شہرت کے طلب گاروں کی قلعی کھولتا ہے تو اُس کی نشتریت قابلِ تعریف ہوتی ہے۔ وہ ظالم اور جابر لوگوں سے نفرت کرتا ہے، اور ستم کیش اہل کلیسا پر خوب برستا ہے والٹیئر کا وار بھرپور ہوتا ہے اور ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"نسلِ انسانی کی بڑی حماقت ہے کہ وہ ان لوگوں کی پرستش کرتی ہے جنھوں نے بہانگِ دہل بدیاں کی ہیں۔"

والٹیئر انسانی حقوق اور انسانی آزادی کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ وہ عقل کی برتری کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ عقل کے ذریعے تمام مصائب و مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مانٹسکو

مانٹسکو آئین و دستور سازی کے معاملات میں گہری بصیرت رکھتا ہے۔ وہ ریاست کے مختلف اقسام پر بحث کرتا ہے۔ اُسے برطانوی طرزِ حکومت بہت پسند ہے۔ کیوں کہ اس میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ پوری طرح آزاد ہیں۔

رُوسو

رُوسو نے انسانی مساوات و حریت پر ایک فلسفیانہ مقالہ لکھا۔ جس میں اُس نے

حکومت کے چلانے کے اصول بیان کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔"

رُوسو کہتا ہے کہ:

"بادشاہتوں کو ختم کر کے عوام کی متفقہ مرضی سے ملک کا آئین تیار ہونا چاہیئے کیونکہ عوام کی خواہش ہر مسئلے پر اقتدار اعلےٰ کا درجہ رکھتی ہے۔"

حریت پسندی اور اشتراکیت کا باہمی تعلق

میسمو سالواڈوری حریت پسندی اور سوشلزم کے باہمی تعلق کے متعلق لکھتا ہے:

"یورپ میں شروع ہونے والی دوسری ہمعصر تحریکوں کی طرح اشتراکیت کو اُس وقت بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب کہ اُسے یورپ کی حریت پسندی کی روشنی میں دیکھا جائے .... یورپی حریت پسندی کی بنیاد انفرادیت پر مبنی تھی۔ اس تصور پر کہ چونکہ فطرت نے انسان کو عقلِ سلیم جیسے جوہر سے نوازا ہے اس لیے وہ اپنے افعال و اعمال کا خود ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ اس نے فرد کو سیاسی اور ذہنی غلامی سے نجات اور آزادی دلانے کے لیے ایسے منظم معاشروں کے قیام کو بنیادی شرط قرار دیا، جن میں ہر شخص بلا روک ٹوک اپنی انفرادی رائے ظاہر کر سکے .... حریت پسندی نے شخصی آزادی پہ عائد شدہ دوسری پابندیوں کا خاتمہ کر دیا اور ضابطۂ حیات کی تشکیل پر زور دیا جسے یورپ والے انسانی حقوق اور امریکہ والے شہری آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس امر کو تسلیم کرایا کہ بنی نوع اخلاقی طور پر مساوی ہیں۔ سیاسی حریت پسندی کے تصوّر نے پارلیمانی اداروں کی شکل اختیار کی جو ابتداءً محدود رائے دہندگی کی بنیادوں پر قائم تھے۔ لیکن جب ان میں جمہوری رجحانات راہ پا گئے تو اُن کی بنیادیں عالمگیر رائے دہندگی

پر استوار ہوئیں . . . . . . جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، حریت پسندی نے مختلف نظریات کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ ان سب کی بنیاد اس امر پر تھی کہ انسان اور اس کے مسائل تک عقلی و عملی نقطۂ نظر سے رسائی حاصل کی جائے۔ اس اندازِ فکر نے کلیسائی مذہبی اعتقادات کے روایتی دباؤ کو کمزور کر دیا۔ اور جدید علوم کی ترویج وارتقاء کے لیے اور نئے نظریات کی تخلیق کے لیے سازگار فضا قائم کر دی (اگرچہ ان میں ایسے نظریات کی کمی نہیں تھی جو آپس میں ٹکراتے تھے) . . . . . حریت پسندی کی تحریک کی بدولت جن ذہنی تبدیلیوں سے ہر قوم کے افراد کو دوچار ہونا پڑا، اس سے بے اطمینانی میں اضافہ ہو گیا۔ زندگی کے اقتصادی شعبوں نے خاص طور پر تباہی مچا دی۔ اگرچہ یورپ کے عوام انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع سالوں میں ایک صدی پہلے کے مقابلے بہت کم غریب تھے۔ لیکن اب وہ اپنی غربت کا بڑا احساس کرنے لگے تھے۔ اور اپنی بے اطمینانی کا اظہار بڑی آزادی اور بے باکی سے کرتے تھے۔ ان ایام میں اگرچہ بے انصافی بڑی حد تک کم ہو گئی تھی لیکن جو بے انصافیاں رہ گئی تھیں اُن کا احساس بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

اُنیسویں صدی کے آخر میں حریت پسندی اور انفرادیت کے خلاف ردِّ عمل کا جو وسیع طوفان اُٹھا۔ وہ یا تو بحیثیت مجموعی حریت پسندی کے خلاف یا اُن عناصر میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کے خلاف تھا، جس سے یا جن سے وہ کسی نہ کسی وقت ہم آہنگ تھی۔ جو لوگ تحریک حریت سے قبل کے نظریات واقدار کے قائل تھے۔ انہوں نے حریت پسندی کی افادیت سے بالکل انکار کر دیا اور اس طرح پکے قوم پرستوں، نسل ورنگ کے مویدوں اور بعض دوسرے لوگوں نے بھی انکار کر دیا۔ جن لوگوں نے حریت پسندی کے بعض اصولوں کو قبول کر لیا اور باقی کو رد کر دیا، اُن میں سوشلسٹوں کی تعداد سب سے غالب تھی۔

سوشلزم نے پہلے پہل برطانیہ اور فرانس میں اپنے قدم جمائے ۔۔۔۔۔
ان کا خیال تھا کہ حریت پسندی کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ جو برائیاں
آگئی ہیں وہ صرف انفرادیت کو کچلنے اور معاشرہ کو عدل و انصاف
کی کامیابی کا ذمہ دار قرار دینے سے دور ہو سکتی ہیں ۔ ان لوگوں
نے سرمایہ داری کے بجائے اجتماعیت کی حمایت کی ۔ کچھ لوگوں نے
سرمایہ داری کے بجائے بنیادی صنعتوں کو اشتراکی ملکیت اور نظم و
نسق میں لے لیا جائے اور کچھ کا خیال تھا کہ تمام اقتصادی جدّوجُہد
کو اشتراکی بنا دیا جائے ۔ صنعت و حرفت کے کارخانوں کو قومی
ملکیت میں لینے کے بجائے وہ بین الاقوامیت کے حامی تھے "

{ میسیمو سالوا ڈوری : جدید کمیونزم کا ارتقاء
صفحات ۱۴-۹ ۔ ترجمہ : ضیاءالدین احمد برنی }

اصلاح کلیسا اور حریت پسندی کی تحریکوں نے پرانی قدروں کو پامال کر کے
بے قید آزادی کے لیے راہ ہموار کر دی تھی ۔ حریت پسندی کوئی تعمیری نظریہ تو تھا
نہیں جو اس خلا کو مثبت طور پر پُر کر دیتا جو کلیسائی نظام اور متعلقہ اقدار کی شکست و
ریخت سے پیدا ہو گیا تھا ۔

حریت پسندوں نے کئی ایک خرابیوں کو جنم دیا اور سوشلسٹوں کو یہ کہنے کا موقع
ہاتھ آگیا کہ اجتماعیت کو اپنا کر پیدا شدہ خرابیوں کا انسداد کیا جا سکے ۔ ظاہر ہے
اس پس منظر میں سوشلزم کو پھلنے پھولنے کے لیے ایک سازگار ماحول مل گیا ۔

صنعتی انقلاب اور اشتراکیت

اہل یورپ کی استعمار کوشی کی بدولت تجارت کو بڑی ترقی حاصل ہوئی ۔ اہلِ یورپ
نو آبادیات کی دولت لوٹ لوٹ کر اپنے گھروں میں سونے چاندی کے انبار لگا
رہے تھے ۔ تاجر دولت میں کھیل رہے تھے اور عوام بدستور معاشی بدحالی کا شکار
تھے ۔

اسی اثنا میں بھاپ کی دریافت اور مشینری کی ایجاد نے صنعت و حرفت کی

دنیا میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاریگر کی جگہ دیو قامت مشینوں نے لے لی اور متوسط طبقہ کی جگہ کروڑ پتی کارخانہ داروں نے لی مشینری کا استعمال عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی، چنانچہ سرمایہ دار صنعت کاروں کی بن آئی اور تمام دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ مشین اور مزدور کے تعلق پر مارکس اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"مشین انسان کو بے کار بنا دیتی ہے۔ اس بے کاری کا پہلا سبب تو یہ ہوتا ہے کہ مشین چونکہ لڑکے لڑکیاں بھی چلا سکتی ہیں اس لیے وہ بھی مزدور بن جاتے ہیں .... یہی وجہ ہے کہ جب مشین کاری کا دور شروع ہوا تو لڑکے لڑکیاں بہت تعداد میں مزدور بن گئے۔ جس سے عام مزدور کی اجرت گر گئی۔ اجرت گرنے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو بھی مزدور بنانے پر مجبور ہو گئے۔

مارکس کے خیال میں سرمایہ داری کے دور میں مشین کا استعمال مزدور کی صلاحیت بڑھاتا ہے، اور مزدور زیادہ سے زیادہ "زائد قدر" پیدا کرنے لگتا ہے جو سرمایہ دار بطور منافع وصول کرتا ہے۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق سرمایہ دار کی یہ نفع اندوزی ایسی طبقاتی کش مکش کو جنم دیتی ہے، جس کا خاتمہ ایسے انقلاب پر ہوتا ہے جس میں پرولتاری طبقہ کامیاب ہوتا ہے۔

عالمی جنگیں اور اشتراکیت

دونوں عالمی جنگیں اشتراکیت کے لیے باعث رحمت ثابت ہوئیں۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ کے قریب روس میں لینن کی سرکردگی میں سوشلسٹ حکومت قائم ہوئی اور دوسری جنگ کے آخری مرحلہ پر ماؤزے تنگ کی سربراہی میں چین میں سوشلسٹ حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

دونوں عالمی جنگوں کا تجزیہ اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہے کہ اتحادیوں کی کوتاہ اندیشی اور عدم تدبر کی وجہ سے اشتراکیت کو ایسا قیام و استحکام

نصیب ہؤا ہے کہ اب اتحادی خود اشتراکیت کی عالمی طاقت سے خوف زدہ ہیں ۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر اتحادی جرمنی کے وجود کو ختم نہ کرتے تو جرمنی سوشلزم کے پھیلاؤ کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتا ۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام سے لے کر آج تک اتحادی مفکرین اس غلطی کا اعتراف کرتے آرہے ہیں ۔

باب ۹

اشتراکیت کی فکری اساس

کسی تحریک یا عقیدے کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے دو امور فکری اساس اور عملی صورت کا جائزہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ سائنس و فلسفہ کے جدید ترین نظریات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہم بے میل درغبت مادہ پرستی اور سوشلزم کی مشترکہ اساس کا از سرِ نو جائزہ لیں اور دیکھیں کہ جس بنیاد پر فکر و عمل کا اتنا بڑا محل تعمیر کر دیا گیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے۔ اسی طرح آج سوشلزم کی عملی صورت ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے اب ہمارے لیے یہ تعین کرنا کہ سوشلزم نے فی الواقع انسان کو کیا دیا ہے کوئی امرِ محال نہیں۔

مارکس کا مشاہدہ

مارکس کے فکر و فلسفہ کی بنیاد اُس کے عصری اور قریبی ماحول کے مشاہدے پر قائم ہے۔ مارکس نے پاپائیت کے رائج کردہ انسانیت کُش کلیسائی نظام کا مطالعہ کیا تھا۔ مذہب اسلام کا مطالعہ اُس نے نہیں کیا۔ دوسری بات جو اُس کے مشاہدے میں آئی وہ جاگیردار اور سرمایہ دار کی لُوٹ گھسوٹ تھی۔ اہلِ کلیسا مذہب کے نام پر استحصال کرتے تھے اور سرمایہ دار محنت کار کا خون چُوستے تھے، یہ دونوں مشاہدے المناک تھے۔ ان مشاہدات کی بنا پر مارکس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذہب استحصال بالجبر کا ذریعہ ہے، اور مذہبی پیشوا سرمایہ دار کے آلۂ کار ہیں۔ مارکس کا یہ نتیجہ محدود مشاہدے اور مخصوص عہد کے مخصوص عوامل کا حاصل ہے۔

مادیت پہلے ہی اپنا تسلط جما چکی تھی اور لوگ لادینیت کی راہ پر گامزن ہو چکے

تھے۔ مارکس نے الحاد اور مادیت کے امتزاج سے ایک ضابطہ حیات کی تشکیل کر دی۔

اسلام سرمایہ داری کے خلاف ہے

کلیسائی نظام کے مشاہدے کی بنا پر مارکس اور اس کے مقلدین اس بات کا خوب پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مذہب سرمایہ داری کی پشت پناہی کرتا ہے لہذا مذہب ہی بنائے فساد ہے۔ یہ بات تاریخی اعتبار سے بالکل غلط اور گمراہ کن ہے اسلام نے ارتکاز دولت کی ہمیشہ مخالفت کی ہے اور اپنے معاشی نظام میں عمل تمرکز کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

واقعات کی قوتِ استدلال ناقابلِ تردید ہوتی ہے۔ اسلام کے ماننے والوں نے اسلامی تعلیمات کی روح کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے اور دنیا کے مال و متاع کو پائے استحقار سے ٹھکرایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا اور ان کی زبردستی کی برملا مذمت کی ہے۔

امام جعفر صادق

منصور شان و شکوہ کے ساتھ تختِ شاہی پر بیٹھا ہے۔ دربار کی رونق دیدنی ہے۔ اس عالم میں ایک نحیف و نزار لیکن پُرجمال چہرہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ امام جعفر صادق ہیں۔ منصور عباسی اُنہیں دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو جاتا ہے۔ اتفاقاً ایک مکھی منصور کو پریشان کرنے لگتی ہے۔ منصور جناب امام سے پوچھتا ہے:

"اس مکھی کو پیدا کرنے کا کیا مقصد ہے"؟

جناب امام برجستہ جواب دیتے ہیں:

"مغرور بادشاہوں کے غرور کو خاک میں ملانے کے لیے"۔

منصور بر بنائے مصلحت خاموش رہتا ہے۔ جب امام رخصت ہونے لگتے ہیں تو منصور کہتا ہے:

"کوئی خدمت فرمایئے"؟

امام جعفر جواب دیتے ہیں :

"میں تم سے صرف ایک خدمت چاہتا ہوں کہ آئندہ مجھے دربار میں آنے کی زحمت نہ دی جائے۔"

امام جعفر صادق نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، اپنی روزی آپ کماتے تھے، خود بھوکے رہتے تھے اور دوسروں کو کھلاتے تھے۔ نماز مغرب کے بعد روٹیوں کا ٹوکرا اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے غریبوں میں تقسیم کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہ

اموی اور عباسی حکمرانوں نے حضرت امام ابوحنیفہ کو اپنی مخالفت سے باز رکھنے کے لیے بڑے بڑے لالچ دیئے، لیکن ناکام رہے۔ ایک دفعہ منصور عباسی نے ایک خطیر رقم امام ابوحنیفہ کی خدمت میں پیش کی، لیکن آپ نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا کہ :

"یہ روپیہ بیت المال کا ہے، جو عوام کی ملکیت ہے۔ اس لیے اس مال پر محتاجوں کا حق ہے۔"

منصور نے امام ابوحنیفہ کو قاضی القضاۃ کے عہدۂ جلیلہ کی پیشکش کی تو آپ نے فرمایا :

"فرض کرو کہ میری عدالت میں تمہارے خلاف شکایت دائر کی جاتی ہے اور تم کہتے ہو کہ میں فیصلہ تمہارے حق میں دوں، ورنہ تم مجھے غرقِ دریا کر دو گے۔ تو یہ یاد رکھو کہ میں فیصلہ صادر کر کے انصاف کا خون کرنے کے بجائے دریا میں ڈوب مرنے کو ترجیح دوں گا۔"

منصور عباسی اور اس کی بیوی خاتون میں ایک دفعہ جھگڑا پیدا ہو گیا، منصور نے امام ابوحنیفہ کو دربار میں بلا کر پوچھا :

"ایک آدمی کو ایک وقت میں کتنی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے؟"

امام ابوحنیفہ نے جواب دیا :

"چار"

منصور نے چلّا کر کہا:

"سنا! امام نے کیا کہا؟"

امام صاحب نے فوراً جواب دیا:

"لیکن اس کی ایک شرط ہے۔ آدمی کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا اختیار ہے، بشرطیکہ وہ سب سے ایک سا انصاف کر سکے۔"

امام صاحب کے جواب کا آخری حصہ منصور کی خواہش کے منافی تھا۔

جب شام کو امام صاحب گھر پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی روپوں کا تھیلا اور خاتون کی طرف سے شکریہ کا خط لے کر انتظار کر رہا ہے۔ امام صاحب نے یہ کہہ کر روپے واپس کر دیئے کہ خوف و طمع سے بلند ہو کر سچ بولنا میرا فرض ہے۔

کوفہ کے گورنر یزید بن عمر نے امام صاحب کو ایک اعلیٰ منصب کی پیشکش کی لیکن امام صاحب نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ گورنر کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنے حکم کی تعمیل ضرور کرائے گا۔ بڑا زور لگایا لیکن امام صاحب کو رضامند نہ کر سکا، وہ اپنے فیصلے پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ جب کوئی بات نہ بنی تو ظالم یزید بن عمر نے امام صاحب کو قید خانے میں بند کر دیا۔ جہاں ہر روز اُن کے نحیف و خستہ جسم پر کوڑوں کی بارش کی جاتی لیکن امام صاحب پر کیا اثر ہوتا۔ قوتِ ایمان تو ہمیشہ سے غیر متزلزل ہے، لوگ جاہ و منصب اور زر و مال کے لیے جوتے چاٹتے ہیں، ضمیر بیچتے ہیں، عزت لٹاتے ہیں، لیکن اہلِ ایمان ان چیزوں پر تھوکتے ہیں اور تھوکنے کی پاداش میں کوڑے کھاتے ہیں۔

ابھی امام ابو حنیفہ کے صبر و تحمل کی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی، خاندانِ عباسیہ کے دوسرے حکمران منصور نے امام صاحب کے ناقابلِ تسخیر عزم کے مقابلے میں عاجز آ کر اُن کو قید خانے میں بند کر دیا۔ اب منصور کے لیے سب کچھ ہرگز نہ ممکن تھا۔ چنانچہ امام صاحب کو زہر دے دیا اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

حضرت امام احمد بن حنبل

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں فتنۂ خلقِ قرآن نے سر اٹھایا اور تین فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ نے بزورِ شمشیر اس فتنہ کو پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ فرمانروا معتزلہ تھے۔ معتزلہ کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالےٰ نے جس طرح اور چیزیں پیدا کی ہیں، اسی طرح اُس نے صفتِ کلام بھی پیدا کی ہے۔ اس بنا پر اُن کا دعویٰ تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور حادث ہے۔ ابوالکلام آزاد اپنی کتاب "تذکرہ" میں امام احمد بن حنبل کے استقلال و ثبات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"یہ وہ وقت تھا کہ قیامِ سنّت و دینِ خالص کو قیامت تک کے لیے فیصلہ ہونے والا تھا اور مامون و معتصم کے جبر و قہر اور بشر مریسی اور قاضی ابنِ داؤد جیسے جابرۂ معتزلہ کے تسلّط و حکومت نے علمائے حق کے لیے صرف دو ہی راستے باز رکھے تھے۔ یا اصحابِ بدعت کے آگے سر جھکائیں اور مسئلہ خلقِ قرآن پر ایمان لا کر ہمیشہ کے لیے اس کی نظیر قائم کر دیں کہ شریعت میں صرف اتنا ہی نہیں جو رسولؐ بتلا گیا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کہا اور کیا جا سکتا ہے اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے، ہر رائے اُس پر قاضی و آمر ہے، ہر فلسفہ اس کا مالک و حاکم ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعضوں نے ابتدا میں استقامت دکھائی لیکن پھر ضعف و رخصت کے گوشے میں پناہ گیر ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جبکہ تمام اصحابِ کار و طریق کا یہ حال ہو رہا تھا اور دینِ خالص کا بقا و قیام ایک عظیم الشان قربانی کا طلبگار تھا تو غور کرو صرف امام موصوف ہی تھے جن کو فاتح و سلطانِ عہد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے نہ تو دعاتِ فتن و بدعت کے آگے سر جھکایا، نہ روپوش و خاموشی و کنارہ کشی اختیار کی اور نہ صرف بند حجروں کے اندر دعاؤں اور مناجاتوں پر قناعت کر لی بلکہ دینِ خالص کے قیام کی راہ میں اپنے

نفس و جود کو قربان کر دینے کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُٹھ کھڑے ہوئے
اُس کو قید کیا گیا، قید خانے میں پھینے گئے، چار چار بوجھل بیڑیاں
پاؤں میں ڈالی گئیں، پہن لیں۔ اس عالم میں بغداد سے طرسوس لے
چلے، اور حکم دیا کہ بلا کسی مدد کے خود ہی اونٹ پر سوار ہوں اور خود
ہی اونٹ سے اتریں۔ اس کو بھی قبول کیا۔ بوجھل بیڑیوں کی وجہ سے
ہل نہیں سکتے تھے۔ اٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ عین رمضان المبارک
کے عشرۂ اخیر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے۔
اور اُس پیٹھ پر جو علوم و معارف نبوت کی حامل تھی لگاتار کوڑے اس
طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ
جاتا اور پھر نیا تازہ دم جلاد اُس کی جگہ لیتا۔ اس کو بھی خوشی خوشی
برداشت کر لیا، مگر اللہ کے عشق سے منہ نہ موڑا، اور راہِ سنت سے
منحرف نہ ہونے پائے۔ تازیانے کی ہر ضرب پر بھی جو صدا زبان سے
نکلتی تھی، وہ نہ تو جزع فزع کی تھی اور نہ شور و فغاں کی بلکہ وہی تھی
جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا یعنی "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق"
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امام احمد کی استقامت و ثبات کی آزمائشیں لگاتار چار بادشاہوں
نے کیں، لیکن بعضھم بالضراء و بعضھم بالسراء۔ مامون،
معتصم اور واثق نے ضرب و حبس سے آزمائش کی اور متوکل نے
تعظیم و تکریم اور عطا و بخشش دنیا سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ان کی استقامت
و عشق حق پر نہ تو خوفِ دنیا غالب آیا اور نہ طمعِ دنیا، دونوں کسوٹیوں
پر ان کا سونا یکساں طور پر کھرا نکلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مامون، معتصم اور الواثق نے جو کچھ کیا وہ معلوم ہے جعفر المتوکل
کا یہ حال ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ متوکل باللہ
ہمیشہ اس فکر میں رہتا کہ کسی طرح پچھلے مظالم کی تلافی کرے۔ ایک
بار اُس نے بیس ہزار سکے بھیجے۔ اور دربار میں بلایا، ایک بار ایک
لاکھ درہم بھیجا اور سخت اصرار کیا کہ اس کو قبول کر لیجئے۔ لیکن ہر مرتبہ

امام موصوف نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا" میں اپنے مکان میں اپنے ہاتھ سے اس قدر کشتکاری کر لیتا ہوں جو میری ضروریات کے لیے کافی ہے ۔"

امام غزالی

امام غزالی کا زمانہ بھی بڑا پُر آشوب تھا ۔ حکومت و سلطنت پر کسی کو لب کشائی کی اجازت نہیں تھی ۔ اس وقت ملک کی اصلاح کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ نہایت آزادی و دلیری سے سلاطین کو اُن کے عیوب و مظالم سے مطلع کیا جائے اور عام لوگوں کو بتایا جائے کہ اُن میں سے ہر شخص کو یہی حق حاصل ہے ۔

مولانا شبلی تاریخی شواہد سے اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک مال و متاع دنیا کی کیا حیثیت ہے اور ایک سچے مسلمان کا اس معاملہ میں کیا موقف رہا ہے :

"امام غزالی نے ان دونوں فرضوں کو نہایت خوبی سے ادا کیا ۔ سلاطین کے مقابلے میں جو چیز لوگوں کو آزادی سے روکتی ہے وہ یہ تھی کہ اہل تیغ و قلم دونوں عموماً سلاطین کے وظیفہ خوار تھے ۔ اور ان کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے ۔ اس لیے سب سے پہلے امام صاحب نے ان کا تتبع قمع کیا ۔ اور ان دونوں کو ناجائز اور حرام قرار دیا ۔ امام غزالی "احیاء العلوم" باب خمس "ذکر ادرارات السلاطین" میں لکھتے ہیں :۔

" ہمارے زمانے میں سلاطین کی جس قدر آمدنی ہے کُل یا قریب کُل حرام ہے اور کیوں حرام نہ ہو ، حلال آمدنی زکوٰۃ ، خمس فئی ، مال غنیمت ہے ۔ سو ان چیزوں کا اس زمانہ میں وجود ہی نہیں ، صرف جزیہ رہ گیا ہے ، وہ ایسے ظالمانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے کہ جائز و حلال نہیں رہتا ۔"

اسی باب میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :

"جو کچھ ان سلاطین کے ہاتھ ہے، سب حرام ہے۔"

سلاطین کے ہاں آمد و رفت رکھنے کے متعلق "احیاء العلوم" میں لکھتے ہیں:

"دوسری حالت یہ ہے کہ انسان ان سلاطین سے اس طرح الگ تھلگ رہے کہ کبھی ان کا سامنا نہ ہونے پائے اور یہی واجب العمل ہے۔ انسان پر یہ اعتقاد رکھنا فرض ہے کہ ان کا ظلم، بغض رکھنے کے قابل ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ نہ ان کی بقا کا خواہش مند ہو، نہ اُن کی تعریف کرے، نہ اُن کے حالات کا پرساں ہو، نہ ان کے مقربوں سے میل جول رکھے۔"

"احیاء العلوم" میں جہاں اس مضمون پر بحث کی ہے کہ سلاطین کے دربار میں جانا ناجائز ہے۔ ناجوازی کی دلیل میں لکھتے ہیں:

"انسان کو سلاطین کے دربار میں ہر قدم پر گناہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ شاہی مکانات مغصوب ہوتے ہیں۔ اور زمینِ مغصوبہ میں قدم رکھنا گناہ ہے۔ دربار میں پہنچ کر سر جھکانا اور ہاتھ کو بوسہ دینا ہوتا ہے اور ظالم کی تعظیم کرنا گناہ ہے۔ دربار میں ہر طرف جو چیزیں نظر آتی ہیں یعنی پردہ ہائے زرنگار، البسۂ ریشمیں، ظروفِ زرّیں، یہ سب حرام ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر چپ رہنا داخلِ معصیت ہے۔ اخیر میں بادشاہ کی جان و مال کی سلامتی کی دعا مانگنی پڑتی ہے، اور یہ گناہ ہے۔"

چونکہ اکثر لوگ دربار داری کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے تھے اس لیے سلف سلاطین کے ہاں آمد و رفت رکھتے تھے۔ اس لیے امام صاحب اس استدلال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

"ہاں بزرگانِ سلف سلاطین کے ہاں آمد و رفت رکھتے تھے لیکن کیونکر؛ ہشام بن عبد الملک حج کرنے گیا تو طاؤس یمانی کو طلب کیا۔ انہوں نے دربار میں پہنچ کر فرش کے کنارے جوتیاں اتاریں۔ پھر السلام علیکم کہہ کر اُس کے برابر بیٹھ گئے اور کہا کیوں ہشام! تیرا مزاج کیسا

ہے ؟" ہشام کو سخت غصہ آیا اور کہا "یہ گستاخانہ حرکتیں ہیں" نہ مجھ کو امیرالمومنین کہہ کر خطاب کیا، نہ کنیت کے ساتھ نام لیا، نہ میرے ہاتھ چومے۔"

طاؤس نے کہا:

"ہاتھ تو میں نے اس لیے نہیں چومے کہ میں نے حضرت علیؓ سے سنا ہے کہ صرف دو شخصوں کا ہاتھ چومنا ہے بیوی کا یا بچہ کا۔ امیرالمومنین کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا کہ تمام مسلمان تجھ کو سلطان نہیں سمجھتے اس لیے اگر یہ لقب استعمال کرتا تو میں جھوٹا ہوتا۔ کنیت کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے انبیاء و اولیاء کے نام بغیر کنیت کے لیے ہیں مثلاً داؤد، سلیمان، عیسیٰ، موسیٰ اور کافروں کو کنیت کے ساتھ خطاب کیا ہے مثلاً مثلاً ابولہب۔"

ہشام متاثر ہوا اور کہا کہ مجھ کو نصیحت کرو۔ طاؤس نے کہا میں نے حضرت علیؓ سے سنا ہے کہ دوزخ میں بڑے بڑے سانپ اور بچھو ہوں گے جو اُن سلاطین کو کاٹیں گے اور ڈنگ ماریں گے جو رعایا پر ظلم کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر اٹھے اور چلے گئے۔"

(شبلی: الغزالی، صفحات: ۲۳۴ - ۲۳۰)

اسلامی عقائد کا ترجمان کون ہے؟

اسلامی عقائد و نظریات کا ترجمان وہ شخص نہیں جو تختِ شاہی پر بیٹھا ہے بلکہ وہ مردِ حق گو ہے۔ جو صاحب و ظالم حکمران کے سامنے سینہ سپر ہے، اور بہانگِ دُہل اعلان کرتا ہے کہ تیرا مال حرام ہے کیونکہ وہ ناجائز طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے اور ناجائز کاموں پر خرچ ہو رہا ہے۔ سچے مسلمان کی نظر میں متاعِ دنیا کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ وہ اُس مال کو جائز و حلال سمجھتا ہے، جو اُس کے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ پھر وہ اس گاڑھے پسینے کی کمائی کو بھی اُس وقت تک استعمال میں نہیں لاتا، جب تک زکوٰۃ کے حصّہ سے اُس کو پاک صاف نہیں کر لیتا۔ یہی

نہیں۔ پھر ارد گرد دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی ایسا شخص تو نہیں جس کو اس پیسے کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہو۔

مارکس کے فکر و فلسفہ کے ماخذ

مارکس کے افکار و نظریات میں کسی جدت یا اُپج کا نشان نہیں ملتا۔ البتہ قوتِ آخذہ انتہائی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ مارکس کی قوت تعمیر و تنظیم بھی لاجواب ہے وہ منزل کا تعیّن کرنے کے بعد انتہائی کاوش و قرینہ سے مفید مطلب مواد کا انتخاب عمل میں لاتا ہے۔ پھر تنظیم و تعمیر کی سحر طرازی سے اس کی ایسی صورت گری کرتا ہے کہ قاری دنگ رہ جاتا ہے۔

مارکس کی مادیت کا سرچشمہ یونان کے فلاسفر ہیر تعلیطس اور دیما قریطس اور روم کے فلسفی ایپکورس اور لکریشس ہیں۔ اس کی جدلیت کے مآخذ زینو، کانٹ، اور ہیگل کے تصوّرات ہیں۔ اسی طرح اس کے فلسفۂ تاریخ کا منبع مالتھوس، کارڈو اور بالخصوص اُس کے اپنے زمانے کے معاشی حالات و واقعات ہیں۔

مارکس کی جدلیت

جدلیت کا یہ فلسفہ جو متضاد اکائیوں کے تصادم سے کائنات کے عمل کی تشریح کرتا ہے تین بنیادی اکائیوں سے چلتا ہے۔ پہلی اکائی تھیز (ابتدا)، دوسری اکائی اینٹی تھیز (نفیٔ ابتدا) اور تیسری سنتھیز (مرکب)۔ ہر پہلی اکائی کی ضد یا جوابی اکائی پیدا ہوتی رہتی ہے اور دونوں کے تصادم سے تیسری اکائی پیدا ہوتی ہے۔ مارکس کائنات کی حرکتی تعبیر پر یقین رکھتا ہے۔ کائنات کی حرکتی تعبیر سب سے پہلے ہیر تیلیطس نے پیش کی تھی۔ مارکس جس نظریہ سے چلتا ہے اُس کی رُو سے قدیم برادریاں جائداد کے اشتراک کے نظریہ پر مبنی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ برادریاں انفرادی اور نجی جائداد کے نظام میں تبدیل ہوگئیں۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق غلاموں کے رکھنے کا رواج تاریخ کے عمل میں تھیز قرار پاتا ہے۔

تھیز کے اپنے بطن سے اینٹی تھیز جنم لیتا ہے اور دونوں کے تصادم سے

سینتھیز رُونما ہوتا ہے ۔ مارکس کہتا ہے کہ : خود تخلیقی تصادم کا یہ عمل تاریخ کو مستقبل کی طرف بڑھاتا ہے جس سے مسلسل ارتقاء کی کڑیاں بنتی چلی جاتی ہیں اور یوں تاریخ کی جبریت اُس عہد کو جنم دے گی جسے کمیونسٹ سماج کہتے ہیں ۔

مارکس اور ہیگل کی جدلیّت کا فرق

مارکس کی جدلیّت کو سمجھنے کے لیے ہیگل اور مارکس کی جدلیّت کا فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ ہیگل کی جدلیّت تصوریّت سے عبارت ہے اور مارکس کی مادیّت سے ۔ ہیگل عالمِ مادی کے احوال و مظاہر کو ذہنی تجریّت کا عکس خیال کرتا ہے ۔ وہ عملِ تفکّر کو جسے وہ تصوّر کا نام دیتا ہے ، اس خارجی دنیا کا خالق قرار دیتا ہے ۔ اس کی تشریح وہ یوں کرتا ہے کہ انسانی ذہن میں جو تغیّرات رونما ہوتے ہیں وہی عالمِ مادی میں رونما ہوتے ہیں اور اس طرح کائنات برابر ارتقائی منازل طے کرتی جاتی ہے ۔

مارکس نے ہیگل کے فلسفے کا مفصل مطالعہ کیا اور اس کے تنقیدی انداز بحث میں خوب مہارت پیدا کی ۔ بعد ازاں مارکس نے اس صلاحیت کو ہیگل کے خلاف استعمال کیا ۔ اس نے ہیگل کے فلسفہ کو اُلٹ کر رکھ دیا اور یہ رائے قائم کی کہ کسی عہد کا فلسفہ اور نظریے اُس عہد کے سماجی اور معاشی کردار کو متعین نہیں کرتے بلکہ خود سماجی اور معاشی حالات ہی کسی عہد کے فلسفہ اور نظریوں کا تعین کرتے ہیں ۔ مارکس کہتا ہے :

> " جدلیّت ہیگل کے ہاں سر کے بل کھڑی ہے ۔ اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ ابہامیّت کے خول سے صحیح فکری گودا نکال لیں تو جدلیّت کو پلٹ کر ٹانگوں کے بل کھڑا کر دیں "

ہیگل کے ہاں اضداد کی پیکار عالمِ تصوّر میں ہے ، جس سے مادی دنیا میں حرکت و تغیّر کا نمود ہوتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ کسی شے کا تصوّر اُس وقت تک ممکن نہیں ، جب تک کہ اس کے تضاد کا تصوّر نہ ہوگا ۔ ہیگل کہتا ہے کہ مادی دنیا تصوّرات کا عکس ہے ۔ ہیگل تاریخ کی تعبیر ، تصوّرات کی پیکار سے کرتا ہے اور

مارکس مادی طریق سے ۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق طبقاتی کشمکش جو متضاد معاشی حالات کی پیداوار ہوتی ہے عمل تاریخ کو متحرک رکھنے کا باعث ہے ۔

ظاہر ہے ایسا نظریہ جو مادی جدلیت پر استوار ہو کسی مذہبی یا اخلاقی تصور کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ مارکس رُوح ، خدا اور روزِ جزا سب کا منکر ہے ۔ وہ کہتا ہے:

"مذہب عوام کے لیے افیون ہے ۔"

یہ قوتِ عمل سلب کر لیتا ہے اور معاشرہ پست ہمتی کا شکار ہو جاتا ہے ۔ وہ اخلاقی ضوابط اور جماعتی نظام کو متصادم خیال کرتا ہے یعنی اخلاقی اقدار کی موجودگی جماعت کے مخصوص تصوّرات کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اس لیے مارکس اخلاق کو روایتی اور اضافی خیال کرتا ہے ۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ عوامل پیدائش کی تبدیلی کے ساتھ اخلاق ، معاشرت اور تمدن سب تبدیل ہوتا رہتا ہے ۔

مادیت کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتی

مارکس کے تمام فکر و فلسفہ کی بنیاد مادی میکانکیت پر قائم ہے جس پر بحث کی جا چکی ہے ۔ یہاں صرف اس بات کا اضافہ کیا جاتا ہے کہ قدما مادے کو ٹھوس سمجھتے تھے ۔ جس کو چھوٹے چھوٹے اجزا میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ اُن کا خیال ہے کہ تقسیم کا یہ عمل جاری رہے تو آخر میں ایسے اجزا نمودار ہوتے ہیں ۔ جن کو مزید تقسیم نہیں کیا جا سکتا ۔ ان اجزا کو ایٹم کہتے ہیں ۔

بالفاظِ دیگر قدما ایٹم کو لایتجزیٰ خیال کرتے تھے ۔ انیسویں صدی تک یہ نظریہ مقبول رہا ۔ جدید طبیعات نے ثابت کیا ہے کہ ایٹم کو تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی ایٹم لایتجزیٰ نہیں جیسا کہ قدما کا خیال تھا ۔

ایٹم کے متعلق جدید انکشافات نے مادیت کے بت کو پاش پاش کر دیا ہے ۔ اب تمام نامور سائنس دان اور فلاسفر جن میں ہائزن برگ ، پلانک اور آئن سٹائن شامل ہیں ۔ کائنات کو ذہن الاصل بلکہ روحانی الاصل قرار دیتے ہیں ۔ جدید انکشافات کی روشنی میں مارکس کی نظریاتی عمارت ، ہوائی قلعہ ثابت ہوئی کیونکہ مادیت جس کے مواد سے یہ تعمیر کی گئی ہے کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتی ۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

جارج برکلے نے یہ کہہ کر علمی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے کہ تمام اجسام جن پر کائنات مشتمل ہے ذہن کے بغیر کوئی معنویت نہیں رکھتے۔

کانٹ کے نزدیک ذہن ایک فعّال قوت ہے، جو مدرکاتِ حسیّہ پر آزادانہ عمل کر کے انہیں علم میں منتقل کرتی رہتی ہے۔ نیز وہ کہتا ہے کہ عالمِ ظواہر ہمارے ذہن اور حواس سے باہر موجود نہیں ہے اور نہ ہی اسے حقیقت کہا جا سکتا ہے۔

فشٹے کا دعویٰ ہے کہ ہر چیز ذہن ہے، روح ہے، عالم صرف ظاہری طور پر مادی معلوم ہوتا ہے۔

برگساں اپنی مشہور کتاب "ارتقائے تخلیق" میں مادی میکانیکیت کی مکمل تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حیات آزاد اور تخلیقی ہے اور مادے کو بہ مقصد بر آری کے لیے تصرف میں لاتی ہے۔

وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ تمام مادی اور غیر مادی اشیاء ارواح پر مشتمل ہیں اور یہ نظامِ ارواح اعلیٰ روح (خدا) کے وجود سے قائم ہے۔

مارکس کی جدلی مادیت کا نظریہ باطل ہے

صدی رواں کے اوائل میں آسٹریا کے عالمِ طبیعیات ارنسٹ ماخ اور جرمنی کے فلسفی ابونیریس نے ایٹم کے متعلق "تجربی انتقاد" کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ جدید انکشافات کی رُو سے کائنات موضوعی ہے، معروضی نہیں، اس لیے مادہ بطور شے غائب ہو گیا ہے۔ لہٰذا مارکس کا مادی جدلیت کا نظریہ جو مادے کی معروضیت پر مبنی ہے، باطل ہو چکا ہے۔

مارکس اپنے نظریہ اضداد کی کوئی فلسفیانہ اور سائنٹفک توجیہہ پیش نہیں کرتا۔ اینٹی تھیسز کے جنم لینے کا نظریہ قیاسی اور فرضی ہے، سائنسی نہیں۔ یہ کیا کہ کبھی مفروضہ اینٹی تھیسز تھوڑے وقفے کے بعد جنم لیتا ہے اور کبھی صدیاں گزر جاتی ہیں اور تھیسز ہی چلتا رہتا ہے اور پھر ہر ملک میں اُن کے محرک ایک سے نہیں۔

حیاتِ انسانی ایک ایسی وحدت ہے جس کے اجزاء میں ایک قدرتی ہم آہنگی اور ترتیب پائی جاتی ہے۔ اس کی وحدت کا ہر ایک جزو ایک مخصوص مقام اور ایک مخصوص تقاضا رکھتا ہے۔ ہر جزو کی اپنی اہمیت ہے، جس کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے جزو کو اس کی خاطر قربان کیا جا سکتا ہے۔ ان اجزاء کے حیات میں توازن و توافق برقرار رکھنا اصل مسئلہ ہے۔ لیکن اس کا حل انسان کے بس کی بات نہیں، اس لیے کہ انسان پوری حیاتِ انسانی پر بسیط و منصفانہ نظر ڈالنے سے قاصر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں الوہی ہدایت کے بغیر چارہ نہیں۔

مولانا مودودی تفہیم القرآن میں جدیدیت پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالمِ اصغر ہے، جس کے اندر بے شمار قوتیں اور قابلیتیں ہیں۔ خواہشیں ہیں، جذبات ہیں، اور رجحانات ہیں۔ نفس اور جسم کے مختلف مطالبے ہیں، روح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں۔ پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے وہ بھی بے حد و حساب پیچیدہ تعلقات سے مرکب ہوتی ہے اور تہذیب و تمدن کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پھر دنیا میں جو سامانِ زندگی انسانوں کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔

انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اُس پورے مرحلۂ حیات پر بہ یک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا، جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو، اُس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے۔ اس کے سارے جذبات و رجحانات میں توازن قائم رہے اس کے سب اندرونی اور بیرونی اندازے تناسب کے ساتھ پورے

ہوں، اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اوران سب کا ایک ہموار اور مناسب حل نکل آئے اور مادی اشیاء کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل وانصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہے۔ جب انسان خود اپنا رہنما اور شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو، زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اُس کے دماغ پر اس طرح مسلّط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں، ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بارادہ یا بلا ارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے اور اس کی رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ بے اعتدالی کی سی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حدود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی بغاوت شروع کر دیتے ہیں۔ اور زور لگانا شروع کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو مگر انصاف پھر بھی نہیں ہوتا، کیونکہ پھر وہی عمل رونما ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک جس کو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبا دیا گیا تھا، انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اُسے اپنے مخصوص مقتضا کے مطابق ایک خاص رُخ پر لے جاتا ہے، جس پر دوسرے پہلوؤں، ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا، ہمیشہ وہ ہچکولے ہی کھاتی رہتی ہے۔ اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھکتی چلی جاتی ہے۔ تمام وہ راستے جو انسان نے خود اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں خطِ منحنی کی شکل میں واقع ہے، غلط سمت چلتے ہیں اور غلط سمت پر ختم ہو کر کسی دوسری غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

ان بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو

بالکل وسط میں واقع ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں، اور خواہشوں کے ساتھ، اس کے تمام جذبات ورجحانات کے ساتھ، اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ کوئی کجی، کسی پہلو کی بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ بے انصافی نہ ہو، انسانی زندگی کے ارتقاء اور اس کی کامیابی و بامرادی کے لیے سخت ضروری ہے انسان کی عین فطرت اس کی راہ کی طالب ہے۔ اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہراہ کو ڈھونڈتی ہے مگر انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے اس کی طرف صرف خدا ہی راہنمائی کر سکتا ہے۔

قرآن اسی راہ کو سواء السّبیل اور صراطِ مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ بے شمار ٹیڑھے راستوں سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ جو اس پر چلا وہ یہاں راست رَو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے۔

موجودہ زمانے میں بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے در پے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی جاتی ہے۔ یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ جدلی عمل انسانی زندگی کے ارتقاء کا فطری طریقہ ہے، وہ اپنی حماقت سے سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقاء کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (Thesis) اُسے ایک رُخ پر لے جائے۔ پھر اس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعوئے (Antithesis) اُسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے اور پھر دونوں کے امتزاج سے ارتقائے حیات کا راستہ بنے۔ حالانکہ یہ دراصل ارتقاء کی راہ نہیں بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء میں بار بار مانع ہو رہے ہیں۔ جس پہلو کو نظر انداز کیا جائے گا وہ بالآخر بغاوت کرے گا۔"

مارکس کا نظریۂ تاریخ یک رُخی ہے

مارکس کا نظریۂ تاریخ یک رُخی ہے ، اس کے خیال کے مطابق اگر ساری تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے تو ماننا پڑے گا کہ انسانی تاریخ اس قدر مختصر ہے کہ چند صفحوں میں بیان کی جا سکتی ہے۔ پھر تاریخ میں اس جبریت کا نشان بھی نہیں ملتا، جس کا دعویٰ مارکس کرتا ہے۔

طبقاتی کش مکش کی تاریخ پوری انسانی تاریخ تو کیا، تاریخ کے اُس حصہ کا بھی عشر عشیر نہیں جو اولوالعزم فاتحین کی کشور کشائی کا مرہونِ منت ہے۔ تاریخ اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ بسا اوقات فردِ واحد نے دنیا کے بیشتر حصّوں کو تہ و بالا کر دیا کرسٹوفر ڈاسن کہتا ہے :

"تاریخ میں پوری دنیا کی صورتِ حال اچانک محمدؐ یا اسکندر ایسے فردِ واحد کے عمل سے تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔"

Christopher Dawson : Dynamics of world History p. 257

انسانی فطرت ناقابلِ فہم حد تک رنگا رنگ اور پیچیدہ ہے۔ اکثر انسان کی ظاہری صورت اور باطنی شخصیت میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی۔ اصل آدمی تو ظاہری شکل و صورت اور اوضاع و اطوار کے دبیز پردوں میں چھپا رہتا ہے۔ کسی شخص کی حقیقی انفرادیت نہ تو گفتگو میں بے نقاب ہو سکتی ہے اور نہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مارکس نفسِ انسانی کی بوقلمونی پر نظر نہیں رکھتا تھا۔ ہر شخص میں فرقِ مدارج کے ساتھ ایک خواہش یا جذبہ ہوتا ہے جو باقی تمام خواہشات یا داعیات پر حاوی ہوتا ہے۔ بعض لوگ شہرت و ناموری کی خاطر دولت خرچ کرتے ہیں، خطرات مول لیتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے ہیں۔ بعض لوگ فتح و نصرت کے جذبہ سے سرشار ہیں اور ہر ایک کو زیرِ نگیں کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو دوسروں کو رَوندنے، کچلنے اور ملیامیٹ کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

ہیرلڈلیم اپنی کتاب "چنگیز خان" میں فاتح اعظم کے حالاتِ زندگی اور فتوحات کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔ چنگیز خان نے سات سو برس قبل ربع مسکون کے نصف حصہ پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ تاریخ میں اُس کو قاتلِ اعظم، "جنگ جوئے کامل" اور قہرِ خدا کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہیرلڈلیم لکھتا ہے کہ:

"جب چنگیز خاں اپنے لشکر کے ساتھ کوچ کرتا تو اس کا سفر میلوں پر نہیں بلکہ عرض بلد اور طول بلد پر محیط ہوتا۔ اس کے راستے پر جو شہر آتے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے اور دریاؤں کے رُخ بدل جاتے۔ ان لشکروں کے گزر جانے کے بعد، ان علاقوں میں جو کبھی آباد تھے۔ بھیڑیوں اور کرگسوں کے سوا کوئی مخلوق زندہ نہ بچتی۔"

ہیرلڈلیم چنگیز خاں کی ذہنی ساخت کو یوں بیان کرتا ہے:

"ایک دن قراقرم میں اپنے شامیانے میں بیٹھے اُس (چنگیز خان) نے اپنے محافظ دستے کے ایک سردار سے پوچھا: "دنیا بھر میں سب سے زیادہ لطف کس بات میں آتا ہے؟"

سردار نے ذرا سوچ کر جواب دیا:

"کھلا میدان ہو، روزِ روشن ہو، اور آدمی تیز گھوڑے پر سوار ہو اور ہاتھ پر شہباز بیٹھا ہو جو خرگوشوں کو چوکنا کر دے۔"

چنگیز خاں نے کہا:

"نہیں! اپنے دشمنوں کو کچلنا اور اُن کے سروں کو اپنے قدموں میں گرا دینا، اُن کے گھوڑے اور سامان چھیننا، اُن کی عورتوں کا نالہ و بکا سننا اور اس سے زیادہ کسی بات میں مزہ نہیں۔"

اس صنف میں تیمور، سکندر، نپولین اور عصرِ حاضر کے کئی ڈکٹیٹر کھڑے ہیں۔

مارکس نے اُن رُوح پرور انقلابات کا مطالعہ بھی نہیں کیا جو انبیاء نے برپا کئے اور جن کے اثرات انمٹ اور ثمرات لازوال ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے آج بھی دنیا کے بہت بڑے حصے میں موجود ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کی شریعت زندۂ جاوید ہے اور دنیا کے ہر گوشے سے توحید کی اذان بلند ہوتی ہے۔

انبیاء پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور ساری نسلِ انسانی اُن کی مخاطب تھی۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے ساتھ کوئی جماعت تھی اور نہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی طبقہ۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں نہ کاشت کار اور جاگیردار کی کشمکش تھی اور نہ مزدور اور سرمایہ دار کی چپقلش۔

اوّلیت اور برتری خیال کی ہے نہ کہ معاشی عوامل کی

مارکس معاشی محرکات کی اوّلیت و حاکمیت کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشی عوامل ہی کسی عہد کے نظریات و عقائد کو متعین کرتے ہیں۔ مارکس کمیونسٹ مینی فیسٹو میں لکھتا ہے:

> "تاریخ اس سے زیادہ کسی اور چیز کی وضاحت نہیں کرتی کہ ذہنی تخلیق اُس نسبت سے بدلتی ہے، جس نسبت سے مادی حالات بدلتے ہیں۔"

اینجلز اینٹی ڈیورنگ میں اس خیال کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> "ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں . . . . . تمام قدیم اخلاقی نظریے ایک خاص دَور کے معاشی حالات کی پیداوار ہیں۔"

فکر و تخیّل نے ہمیشہ انسانی امکانات کی نشاندہی کی ہے اور نئی نئی منزلوں کی طرف راہنمائی کی ہے۔ خارجی زندگی کے گوناں گوں احوال و ظروف اسی عمل تفکر کا کرشمہ ہیں۔ تخیل جو ایک نہایت ہی لطیف و نازک حقیقت ہے اپنی اختراعی قوت کی بدولت ظاہری واقعات و حالات سے ایسے نکتے تلاش کر لیتا ہے جو بالآخر عظیم ایجادات و انکشافات کا باعث بنتے ہیں۔

مدتوں انسان ایسے بہادر انسانوں کی داستانیں بیان کرتا رہا ہے جو آن کی آن میں سمندروں کو عبور کر لیتے تھے۔ ایک جست میں بلند ترین چوٹیوں پر پہنچ جاتے

تھے، اور فضاؤں میں دُور دُور اُڑتے پھرتے تھے۔ یہ سب افسانے فکر و تخیل نے تراشے تھے، جو اب ہوائی جہازوں، بحری جہازوں اور خلائی طیاروں کی صورت میں حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ پھر وہ چیز جو عالمِ خیال میں ظاہر ہوتی ہے بالآخر عملی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اور جو چیز تصور میں نہیں آتی وہ کبھی مادی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔

معنی اپنا لفظ، خیال اپنی زبان، رُوح اپنا جسم اور نظریہ اپنی تعمیلی صورت پیدا کر لیتا ہے۔ خیال یا تصور کی تقدیم ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ کسی نظام کے وجود میں آنے سے پہلے اس کا ذہنی وجود ناگزیر ہے۔ اور ہر خارجی نظام اپنے ذہنی اور نظریاتی وجود کا تابع ہے۔

انقلابِ فرانس کے اسباب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ والٹیر اور رُوسو کے خیالات اور لٹریچر نے عوام کے ذہنوں کو بدل کر رکھ دیا اور عوام جذبۂ آزادی سے سرشار ہو کر اپنے حقوق کے لیے دیوانہ وار اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مارکس نے بھی تو یہی کیا تھا۔ اُس نے لوگوں کے سامنے جدید فلسفۂ حیات پیش کیا، اپنے افکار و نظریات کی خوب اشاعت کی۔ دس برس کی محنتِ شاقہ سے "سرمایہ" کی تکمیل کی۔ اس کے ساتھیوں نے مزدوروں اور کاشت کاروں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف بھڑکایا اور تقریروں اور تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کے تمام دُکھوں کا علاج اشتراکیت ہے۔ خارج میں کوئی انقلاب اُس وقت تک رونما نہیں ہوتا جب تک ذہن میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو۔ ذہنی انقلاب خارجی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ جدید سائنسدان اور فلاسفر خیال و ذہن کی اوّلیت و برتری کو مانتے ہیں۔

قرآنِ پاک میں افلا یعقلون، افلا یتفکرون ایسے ارشادات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ تمام مظاہرِ کائنات دراصل آیات اللہ ہیں اور قرآن ان کے مشاہدے کی ہدایت بھی کرتا ہے اور تفکر کی تلقین بھی، کیونکہ تفکر کو تمام انسانی تحصیلات پر تقدم حاصل ہے۔

انسانی شعور اور ارادے کے بغیر عمل تاریخ ممکن نہیں

مارکس کے نزدیک انسانی مادی حالات کی پیداوار ہے اور تاریخ پہلے سے ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک منزل کی طرف گامزن ہے۔ اگر یہ سب کچھ انسانی شعور اور ارادے کے بغیر ہو رہا ہے تو زندگی میں فرد کا کیا رول ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اشتراکیوں کے عمل اور عقیدے میں کوئی مطابقت نہیں۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ جب تاریخی عمل ایک طے شدہ امر ہے تو زار کے خلاف محاذ آرائی کرنے، مزدوروں اور کسانوں کو بھڑکانے، ہانگیر ہڑتالیں کرانے، قتل و غارت کا بازار گرم کرنے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اپنی زندگیوں کو ہلاکت میں ڈالنے کا کیا مقصد تھا۔

۱۹۱۷ء میں لینن زارِ روس کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش میں مصروف تھا یہ الگ بات ہے کہ سازش کامیاب رہی۔ فرض کیجیے سازش ناکام رہتی اور لینن گرفتار ہو جاتا اور اس عالم میں کوئی اس سے سوال کر بیٹھتا کہ مارکس کے نظریے کے مطابق تاریخ خود بخود متعینہ کمیونسٹ سماج کی طرف بڑھ رہی ہے تو تم نے خواہ مخواہ اپنی زندگی کو خطرے میں کیوں ڈال دیا تو لینن کیا جواب دیتا۔

واقعات اشتراکی نظریات کا منہ چڑاتے ہیں۔ انقلاب سے پہلے کے وقت اور انقلاب کے بعد لینن نے جو پاپڑ بیلے ہیں، اور ناجائز حربے استعمال کیے ہیں تاریخ اُن کی شاہد ہے۔ لینن اس بات کا اعتراف کھلے بندوں کرتا ہے کہ دہشت گردی اُن کی حکمتِ عملی کے بنیادی اصول ہیں۔

> "اصولاً ہم نے دہشت گردی کو کبھی نہیں چھوڑا اور نہ اسے چھوڑ سکتے ہیں۔"
>
> (ای۔ ایچ۔ کار: بالشویکی انقلاب صفحہ ۱۵۷)

ایک اور مقام پر لینن اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

> "اگر ضرورت پیش آئے تو مزدور تنظیموں میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے، اُن میں گھسے رہنے اور ہر نیت پر اشتراکی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے

لیے ہر قسم کے حربوں سے بلا تکلف کام لو، سازش، جوڑ توڑ، غیر قانونی ذرائع کا استعمال، اور دھوکا وغیرہ سب سے کچھ لیو۔ فائدہ اٹھاؤ

Lenin, West Wing Commu:ism Vol. I p. 38.

(لینن: اشتمالیت کا بایاں بازو جلد I صفحہ ۳۸)

مادی ماحول اور تہذیبی زندگی

اشتراکیوں کا یہ نظریہ مادی ماحول انسان کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی صورت گری کرتا ہے، تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔

ایک زمانے میں تمام دنیا بُت پرست تھی، لیکن مختلف ملکوں کے معاشی حالات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق مختلف ملکوں میں مختلف معاشی حالات کے تحت مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا وجود ہونا چاہیئے تھا۔

مارکس نے تاریخ انسانی کو جن مختلف اَدوار میں تقسیم کیا ہے اُس کے مطابق رومی اور قرونِ اولیٰ کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دَور میں تھے۔ دونوں میں عواملِ پیدائش ایک جیسے تھے۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق دونوں قوموں کی تہذیب، تمدن اور مذہب ایک جیسے ہونے چاہئیں تھے، لیکن عرب توحید پرست تھے اور رومی بُت پرست تھے۔ عربوں کی زندگی زہد و تقویٰ سے عبارت تھی اور رومیوں کی زندگی عیش و عشرت سے، معاشی حالات ایک جیسے تھے لیکن مذہبی اور تہذیبی حالت ایکدوسرے کے برعکس تھی۔

انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس یکساں حالت کا نتیجہ تھے۔ دونوں ملکوں میں غریب اور امیر، غلام اور آقا کی جنگ تھی۔ دونوں ملکوں میں ظالم بادشاہوں اور بدعنوان اہلِ کلیسا نے عوام کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ دونوں ملک جنگ اور خانہ جنگیوں کے طویل دَور سے گزر رہے تھے۔ دونوں ملک ایامِ خانہ جنگی میں انسانی خون میں نہائے تھے۔ اور بالآخر دونوں ملکوں میں قدیم بادشاہتوں کا خاتمہ ہوگیا تھا۔

ان پُر آشوب حالات نے دونوں ملکوں کی معیشت بالکل تباہ کر دی تھی۔ اور دونوں ملک ایک ایسے معاشی حالات سے دو چار ہو گئے تھے۔ لیکن روس میں اشتراکی ڈکٹیٹر شپ قائم ہے اور فرانس میں صدارتی نظام حکومت رائج ہے۔ دونوں کو یکساں معاشی حالات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن دونوں کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کا فرق اس قدر نمایاں ہے کہ محتاج بیان نہیں۔

تاریخ سے بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ ایک ہی قسم کے مادی حالات و مسائل کا مختلف قوموں پر مختلف ردِّ عمل ہوا اور ایک ہی زمانہ میں یکساں معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے بالکل مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کیے گئے۔

ٹائن بی کہتا ہے کہ:

"۷۲۵ ق م اور ۵۲۵ ق م کے درمیانی عرصہ میں یونانی ریاستوں میں آبادی کا دباؤ بڑھ گیا، جس سے خوراک کی فراہمی کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس زمانہ میں تمام یونانی ریاستیں اپنی غذائی ضروریات کھیتی باڑی کے ذریعہ پوری کرتی تھیں اور کوئی ریاست غلّہ برآمد کر کے نفع نہیں کماتی تھی۔"

جب ریاستوں پر آبادی کا دباؤ بڑھ گیا تو مختلف ریاستوں نے مختلف طریقوں سے خوراک کا مسئلہ حل کیا۔ کارنتھ اور چالسس نے مقرپس، سسلی اور جنوبی اطالیہ میں تسلط جما کر اپنی نو آبادیاں قائم کر دیں اور اس طرح اپنی فاضل آبادی کا مسئلہ حل کر دیا اور ان ریاستوں کو اپنے داخلی نظام حکومت اور طریق معیشت میں کوئی تبدیلی نہیں کرنی پڑی۔

اس کے برعکس اسپارٹا نے اپنے ہمسایہ علاقوں پر فوجی حملے کر کے اُن کو فتح کر لیا، جس کے نتیجے میں اسپارٹا ایک طویل جنگ میں مبتلا ہو گیا اور اس کو اپنا سارا نظام عسکری بنیادوں پر قائم کرنا پڑا۔ اتھنز نے اس صورتِ حال کا مقابلہ ایک مختلف طریقہ سے کیا۔ اس نے اپنے زرعی نظام میں اس غرض سے تبدیلی کی کہ وہ بعض زرعی اشیاء کو برآمد کر کے نفع حاصل کرے۔ اس کے علاوہ اس نے برآمد کی غرض سے نئی مصنوعات بھی تیار کرنی شروع کر دیں۔

قدرِ زائد کا نظریہ

صنعتی انقلاب کی بدولت اشیا رکی پیداوار بڑے وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔ مشین اتنی بیش قیمت تھی کہ صرف سرمایہ دار خرید سکتا تھا۔ جب مشینوں اور کارخانوں کا جال بچھ گیا اور نتیجتاً جسمانی محنت کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی تو محنت کار کم سے کم معاوضہ کے عوض کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی دُھن میں تھا اور محنت کار کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

مارکس کا خیال ہے کہ سرمایہ داری کے دَور میں مشین کا استعمال مزدور کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے اور مزدور زیادہ سے زیادہ "زائد قدر" پیدا کرنے لگتا ہے۔ مارکس قدرِ زائد کے نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> "مزدور کے پاس اپنی قوتِ محنت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ مزدور کی یہ قوتِ محنت دوسری اجناس کی طرح ایک جنس ہوتی ہے جو بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ سرمایہ دار اس جنس (قوتِ محنت) کو اس لیے خریدتا ہے کہ اس جنس میں ایک ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسری اجناس میں نہیں ہوتی۔ یہ جنس اپنی طبعی قدر سے زیادہ قدر پیدا کرتی ہے، جو سرمایہ دار کا نفع بن جاتی ہے۔"

مارکس کا "قدرِ زائد" کا نظریہ بھی محلِّ نظر ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مبادلہ کی ہر صورت "قدرِ زائد" کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ "قدرِ زائد" ایک اضافی امر ہے۔ زید بیس روپلے کے عوض کتاب اس لیے خریدتا ہے کہ اس کے نقطۂ نظر کے مطابق کتاب میں "زائد قدر" موجود ہے۔ کسی چیز میں فی نفسہٖ "قدرِ زائد" کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ "قدرِ زائد" ذوق و ضرورت کی پیداوار ہے۔

ارتکازِ دولت

اصل مسئلہ تو ارتکاز دولت کا ہے، جو انسانیت کے لیے سوہانِ روح ہے۔ ہوسِ زر کی چھوٹی سی چنگاری بڑھ کر آگ کے ایک ایسے طوفان میں تبدیل ہو جاتی ہے، جو ہر بہر پھیلتا جاتا ہے اور ہر بہر کو بھسم کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوسِ زر کسی انسانی قدر کو گوارا نہیں کرتی۔ جہاں اس نے گھر کر لیا، وہاں نہ رشتہ و پیوند کا لحاظ، نہ اخلاق و مروّت کا پاس اور نہ شرافت و انسانیت کا التزام۔ دولت پرست اور استسقاء کے مریضوں میں کوئی فرق نہیں۔ جس طرح استسقاء کے مریض کی پیاس ہر جرعۂ آب کے ساتھ تیز تر ہوتی ہے اُسی طرح دولت پرست کی آتشِ ہوس دولت کے اضافہ کے ساتھ مزید بھڑکتی ہے۔ یہ آگ ایک مرتبہ جل اُٹھے تو بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ ؎

کوزۂ چشمِ حریصاں پر نشد
تا صدف قانع نشد پر دُر نشد (رومی)

یہ امر کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ جائز طریقوں سے حاصل شدہ آمدنی سے اس قدر ممکن ہے کہ آدمی اطمینان کے ساتھ اپنی معاشی ضروریات پوری کر سکے۔ سیم و زر کے انبار تو ناجائز منافع خوری، چور بازاری، سمگلنگ، بددیانتی، سود خوری، ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی، دھونس دھاندلی، ڈاکہ زنی کے معجزات ہیں۔ وہ لوگ جو حصولِ دولت کی کوشش میں راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں، وہ اسلام کی نظر میں مفسد ہیں، اور بنی نوعِ انسان کے بدترین دشمن ہیں۔

ذخیرہ اندوز اجناس ذخیرہ کر کے مصنوعی قحط پیدا کرتا ہے، جس سے چور بازاری کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔ سمگلر اپنے ملک کی اجناس خوردنی دوسرے ملکوں میں برآمد کرتا ہے اور اپنے ہم وطنوں کو بھوکا مارتا ہے۔ سمگلر تھوڑے سے زیادہ منافع کی خاطر قوم کا خون دوسری قوم کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔

جائز کمائی سے جہاز نما کاریں، سر بہ فلک عمارتیں، بیش قیمت کپڑے اور مرصع

زیورات تو نہیں خریدے جا سکتے۔ طبلے کی تھاپ، پائل کی چھنکار، عریاں جسموں کا رقص، ریس کورس میں ہزاروں کی بار جیت، ہوٹلوں اور شراب خانوں میں جام و سبو کے پیہم دور، بیٹے کی شادی پر کاروں اور کوٹھیوں کی فرمائش، بیٹی کی شادی پر جہیز کی نمائش اور نت نئے فیشنوں کا ہجوم سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کی پیدا کردہ لعنتیں ہیں۔

ہوسِ زر ہوسِ اقتدار کو جنم دیتی ہے اور سرمایہ دار ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کے بل بوتے پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ سیاسی اقتدار حصولِ دولت کا بہترین ذریعہ ہے۔

سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا موازنہ

سرمایہ دار ملکوں میں سرمایہ دار دو چار نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ جمہوری طرز حکومت کی بدولت سرمایہ داروں کا سیاسی اقتدار ایک خاص حد سے متجاوز نہیں ہو سکتا۔ وہ عوام اور حکومت دونوں کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ نئے انتخابات میں اُن کو اقتدار سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایسے قوانین بنائے جا سکتے ہیں کہ سرمایہ داروں کو کھل کھیلنے کا موقع نہ مل سکے۔

اس کے برعکس اشتراکی ممالک میں سیاسی قوت اور معیشت کے تمام وسائل ایک ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اشتراکی ریاست مزدوروں اور کسانوں کے نام پر وجود میں آتی ہے لیکن اقتدار کا سرچشمہ محدودے چند افراد ہوتے ہیں جو ریاست کے نظم و نسق میں ڈکٹیٹر کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

اشتراکی ریاست میں نجی ملکیت کا کوئی وجود نہیں۔ ہر چیز ریاست کے قبضہ میں ہوتی ہے۔ اشتراکی ریاست کے ڈکٹیٹر کی گرفت اتنی ہمہ گیر اور اتنی سخت ہوتی ہے کہ عوام کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، میل ملاپ، بات چیت، یہاں تک کہ اُن کی سوچ، اُن کے ضمیر، اُن کی عزت سب اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ لوگ روٹی، کپڑے اور مکان کے لیے ڈکٹیٹر کی نگاہِ التفات کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ چاہے تو لقمۂ جاں، جنتِ عشا کرے، چاہے تو بھوکوں مار دے۔

اشتراکیوں کی لغت میں لفظ "آزادی" منقا ہے۔ اس ریاست میں نہ لبِ شکوہ وا ہوتا ہے اور نہ صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے، نہ اسٹیج لگتے ہیں، نہ جلوس مرتب ہوتے ہیں نہ ہڑتالیں ہوتی ہیں اور نہ نعرے بلند ہوتے ہیں، تمام ذرائع ابلاغ پہ حکومت کا قبضہ ہے اور وہ شب و روز حکومت کی مدح سرائی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

اشتراکی ریاست میں اظہارِ اختلاف تو کیا محض شک کی بنا پر ہزاروں سر قلم ہو جاتے ہیں لیکن کمال تو یہ ہے کہ نہ جنازہ اٹھتا ہے اور نہ صدائے گریہ بلند ہوتی ہے۔ یوں زندگی، زندگی نہیں اور موت، موت نہیں، حیات و ممات کا تصور انسانوں کی دنیا میں ہوتا ہے کٹھ پتلیوں کی دنیا میں نہیں۔ اشتراکی ریاست میں چند افراد کے سوا باقی سب چلتی پھرتی لاشیں ہیں یا رواں دواں مشینیں ؎

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
(فیض احمد فیض)

دراصل اشتراکیت ایک ایسے غیر مصالحانہ اور انتہا پسندانہ اندازِ فکر و رویے کا نام ہے، جو کسی قسم کی مخالفت یا انحراف کا روادار نہیں۔ مکمل حاکمیت، مکمل سیاسی استبداد، مکمل اقتصادی اجارہ داری اور مکمل ذہنی اذعانیت اس نظام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

سرمایہ دار ملکوں میں سیاسی اقتدار اور معاشی عوامل ایک مضبوط مرکزیت کے قبضہ میں نہیں ہوتے بلکہ مختلف افراد اور جماعتوں میں منقسم ہوتے ہیں جو تبدیل ہوتے رہتے ہیں، لیکن اشتراکی نظام میں سیاسی قوت اور دولت سب ایک جگہ مرتکز ہوتے ہیں جو سیاسی استبداد اور معاشی استحصال کی مہیب ترین صورت ہے۔ قوت و دولت کا فردِ واحد کے ہاتھ مجتمع ہو جانا ستم بالائے ستم ہے۔ مختصر یہ کہ سرمایہ داری انسان کے لیے لعنت ہے تو اشتراکیت انسان کی موت ہے۔

مارکس کے نظریات میں فکری تناقضات

مارکس کے دعاوی و نظریات میں جو تناقضات پائے جاتے ہیں وہ از خود اشتراکی نظریت کی تکذیب کے لیے برہانِ قاطع کا حکم رکھتے ہیں۔ مارکس کہتا ہے کہ:

(۱) تاریخ انسانی ارادے اور شعور کی مداخلت کے بغیر اپنی متعینہ منزل (کمیونسٹ سماج) کی طرف حرکت کر رہی ہے۔

(۲) اس حرکت کا سبب طبقاتی کشمکش ہے جو متضاد معاشی حالت کی پیداوار ہے۔ اسے مفکر کی ژولیدگی کہا جائے یا ذہن کی بددیانتی۔

مارکس ایک طرف تو انسان کو معاشی حالات کا تابع مہمل بتاتا ہے اور دوسری طرف ذرائع پیدائش میں تبدیلی، طبقاتی کشمکش اور انقلاب کا ذکر کرتا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے مارکس نہ تو انسانی شعور اور ارادے کا قائل ہے، اور نہ ہی کسی ماورائے تاریخ عامل کو مانتا ہے اور پھر طبقاتی کشمکش کو تاریخ کی واحد علتِ موثرہ بھی قرار دیتا ہے۔

"کشمکش" شعور اور حرکت کے امتزاج کا نام ہے۔ مارکس طبقاتی کشمکش کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جو بڑی معنی خیز اور فیصلہ کن ہے۔ طبقاتی کشمکش کے اجزائے ترکیبی طبقات، شعور اور عمل ہیں جو لاینفک اور غیر منفصل ہیں۔

طبقات انسانوں پر مشتمل ہیں، شعور انسانی ذہن کی بیداری اور آگہی کا نام ہے۔ اور عمل انسان کی قوت تعمیر و تسخیر سے عبارت ہے۔ ان تینوں اجزاء میں سے کسی ایک جزو کا فقدان طبقاتی کشمکش کا عدم ہے۔

مارکس طبقاتی کشمکش کی اصطلاح استعمال کر کے غیر ارادی طور پر عملِ تاریخ میں انسانی شعور، ارادے اور عمل کی ہمہ گیر کارفرمائی تسلیم کر لیتا ہے۔ سچ بات نہ چاہتے ہوئے بھی زبان پر آ جاتی ہے۔

سائنسی تجربہ و مشاہدہ ہو کہ علمی مذاکرہ و مباحثہ صداقت معلوم کرنے کے دو ہی طریقے ہیں: استقرائی اور استخراجی۔ استخراجی استدلال میں کلیات سے جزئیات کی طرف

آتے ہیں۔ اور اشتراکی استدلال میں شواہد و حقائق کی مدد سے کلیات تک آتے ہیں۔ مارکس کے قائم کردہ مقدمات و نتیجات کسی بھی طریقِ استدلال سے مطابقت نہیں رکھتے۔ کفر کے معنی چھپانے کے ہیں۔ منکرِ خدا قانونِ الٰہیہ کی عملاً پابندی کرتا ہے لیکن زبان سے انکار کرتا ہے، یہی حال اشتراکیوں کا ہے۔

اشتراکیوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ نظریہ کی بدولت نہیں بلکہ تحریک کی بدولت ہوئی ہے، جیساکہ بیان کیا گیا ہے اس تحریک میں تحریر و تقریر کی تمام قوتیں، سعی و کوشش کی تمام صورتیں، حصولِ اقتدار کی تمام تدبیریں بروئے کار آئیں۔ لینن میں قیامت کی قوتِ عمل تھی اور بلا کی تیز رفتاری تھی۔ وہ قوت، تشدد کا عنصریت اور حرکت و عمل کا مجموعہ تھا۔ وہ حصولِ مقصد کی خاطر جھوٹ، فریب، تشدد، سازش، بے وفائی، اپنے پرائے کی خوں ریزی سب جائز و مستحسن خیال کرتا تھا۔ لینن اشتراکی انقلاب کی روحِ رواں اور پہلا اشتراکی ڈکٹیٹر تھا۔

مارکس کے نظریات میں مضمر تناقضات کی ایک اور مثال قابلِ غور ہے۔ مارکس کہتا ہے:

۱۔ کسی ابدی صداقت کا وجود نہیں۔ ہر دور کے نظریات اپنے مخصوص معاشی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔

۲۔ تاریخی عمل کی جبریت بالآخر کمیونسٹ سماج کو جنم دے گا جو مثالی ہوگا اور ریاست کے وجود سے آزاد ہوگا۔

مارکس ایک سانس میں دو متضاد باتیں کہتا ہے، کسی ابدی صداقت کا وجود نہیں اور یہ کہ کمیونسٹ سماج ایک ایسی ابدی صداقت ہے، جس کو ریاست کے وجود کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ کسی بھی منطق اور طریقِ استدلال کی رُو سے یہ دونوں باتیں درست نہیں ہو سکتیں۔ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے کہ کسی ابدی صداقت کا وجود نہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اشتراکی فلسفۂ معیشت جو انیسویں صدی کے مخصوص معاشی حالات کی پیداوار ہے اب فرسودہ و بے کار ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس اگر ابدی صداقت کا وجود تسلیم کیا جائے تو ماورائے تاریخ عامل (خدا) کا اقرار لازم آتا ہے لیکن مارکس کسی مابعد الطبیعاتی وجود کا قائل نہیں۔

انسانی جدّوجہد کا مقصد بلند تر رہا ہے

رشتۂ جسم و جاں برقرار رکھنے کے لیے خوراک کی اہمیت و ضرورت سے کسی کو انکار نہیں۔ داعیۂ معاشی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور تمام ذی حیات میں قدر مشترک ہے۔ پودے، حیوان، انسان سب خوراک پر زندہ ہیں۔ مشین بھی ایندھن مانگتی ہے۔ داعیہ معاشی ابتداءِ آفرینش سے علّت موثّرہ تسلیم کیا گیا ہے اور ہر معاشرے میں معاشی تقاضات پورے کرنے کے لیے نظامِ معیشت قائم ہے۔ یہ کوئی نئی یا نرالی بات نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی حقیقت ہے جس کا انکشاف پہلی مرتبہ مارکس کی زبانِ حقیقت ترجمان سے ہوا ہے۔ اس مسئلہ پر ٹائن بی کی رائے یہ ہے:

> "جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے تو میں اسے کوئی اصولی بات نہیں سمجھتا۔ یہ مسئلہ صرف درجات کے فرق سے تعلق رکھتا ہے۔ تمام حکومتوں میں اجتماعی وسائل سے حاصل کی جانے والی آمدنیوں اور اجتماعی خدمت کا نظام موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی ملک کی معیشت کے پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر کا خطِ امتیاز اُس ملک کی معاشرتی، معاشی، ثقافتی حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ (جو ہر ملک میں وقوع پذیر ہوتی ہیں) اپنے تناسب کے لحاظ سے بدلنا چاہیئے۔"

انسانی معیشت کی اصلاح و ترقی، ہر معاشرے اور حکومت کا مطمح نظر رہا ہے اور ہے۔ اشتراکی اور غیر اشتراکی نظامِ تمدن میں ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اشتراکیت انسان کو انان کا کیڑا گردانتی ہے اور عام روٹی کپڑے کی ضمانت کے عوض انسانی فطرت کے باقی داعیات کو بالجبر دبانے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس غیر اشتراکی نظامِ تمدن انسان کو انسان خیال کرتا ہے اور اس کے تمام داعیات و تقاضات کی جائز و صحت مند تسکین و نمو کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اگر پودے، مشین اور حیوان کی طرح انسان کی الف ابجد اور تائے تمت داعیہ معاشی کی تسکین ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان اور دیگر ذی حیات میں

کوئی خطِ امتیاز نہیں ۔ مشین کو تیل مل جائے تو چلتی رہتی ہے، حیوان کو خوراک مل جائے تو مطمئن بیٹھ رہتا ہے ۔ لیکن انسان مادی لحاظ سے خوشحال ہوتے ہوئے بھی بے تاب و مضطرب رہتا ہے ۔ وجہ ظاہر ہے انسان کا دل تمناؤں اور آرزوؤں کا گہوارہ ہے ۔ اس کی عقل اسرارِ حیات کے فہم و تفحص سرگرداں ہے اور اُس کی رُوح وجدان حقیقت کے لیے بے خود و سرمست ہے ۔ انسانی جدّ و جُہد کا مقصد روٹی کپڑا نہیں بلکہ بلند تر مقصد رہا ہے، جس کی خاطر اُس نے بھوک پیاس برداشت کی ہے، ظلم و ستم سہے ہیں اور آرام و سکون سے منہ موڑا ہے اور جان و مال کی قربانیاں دی ہیں ۔

گوتم بدھ کو کس چیز کی کمی تھی، راجہ کا بیٹا تھا، تخت و تاج کا وارث تھا، غلام و خدمت گار حاضر تھے، جمیع اسبابِ معیشت میسر تھے ۔ پری جمال بیوی تھی ۔ چاند سا بیٹا تھا ۔ ایک رات راج پاٹ تیاگ، ویرانوں میں نکل گیا، حیران و پریشان سرگشتہ و گم گشتہ، بھوکا پیاسا، ننگ دھڑنگ، اتنے فاقے کیے اور اتنے چلّے کھینچے کہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا، لیکن نہ دُکھ کا پاس، نہ تکلیف کا احساس ۔ گوتم حقیقت کی تلاش میں نکلا تھا ۔ اُس کے پیرو آج بھی دنیا کے کئی حصوں میں موجود ہیں ۔

ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق انسان کا مقصدِ وحید نروان حاصل کرنا ہے ۔ جو نفس کشی سے حاصل ہوتا ہے ۔ ہندو جوگی اور سادھو بستیوں کو چھوڑ کر ویرانوں میں ڈیرا لگا لیتے تھے اور تپسیا کرتے تھے، یہ لوگ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور جسم کو سخت ترین اذیتیں پہنچاتے تھے ۔ تپسیا کے مختلف طریقے تھے ۔ بعض سادھو جسم کے کسی ایک حصہ پر نظریں جمائے مدتوں بیٹھے رہتے تھے ۔ اس حالت میں نہ تو آنکھ جھپکتے تھے اور نہ جسم ہلاتے تھے ۔ بعض برسوں ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے تھے ۔ بعض اپنی پسلیوں میں لوہے کے کانٹے اٹکا کر جھول جاتے تھے اور بعض مہینوں سانس روکے بیٹھے رہتے تھے ۔ منت پوری کرنے یا گناہ بخشوانے کے لیے گھر اور مندر کا درمیانی فاصلہ اپنے جسم سے ماپنا پڑتا ہے ۔ کالی دیوی کی پوجا کے وقت انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی، عورتیں مردوں سے بھی آگے تھیں ۔ وہ خاوند کے ساتھ زندہ چِتا میں جل جاتی تھیں ۔

یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں ایک طویل عرصہ تک جنگ رہی۔ یورپ کی بڑی بڑی جنگیں مذہبی نوعیت کی تھیں۔ اکثر راسخ العقیدہ عیسائیوں نے ٹکٹکی پر جل مرنا گوارا کیا لیکن عقیدے سے نہیں ہٹے۔

بعض کیتھولک فرقہ کے عیسائی ترک دنیا کے بعد ساری زندگی خانقاہوں اور کلیساؤں میں ریاضت و عبادت میں گزار دیتے تھے۔ ایسے عیسائی راہب کہلاتے تھے۔ بعض راہب صحراؤں میں سکونت اختیار کر کے بھوکے رہتے اور اپنے جسموں پر کوڑے مارتے تھے۔ راہب مردوں کی طرح راہب عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ یہ لمبے لمبے فراک پہنتی تھیں اور جسموں کو پوری طرح ڈھانپے رکھتی تھیں۔ راہب عورتیں کسی قسم کی آرائش نہیں کرتی تھیں۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ اور بے رنگ ہوتی تھی۔ راہب مرد اور راہب عورتیں تجرّد کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اسلام عیسائیت اور ہندومت کے برعکس زندگی کو بامقصد قرار دیتا ہے۔ اسلام دین حیات ہے اور سعی و عمل اس کی زندگی کا آئین ہے۔ مسلمانوں نے ہندو اور عیسائی راہبوں کی طرح خود اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہیں ڈالا۔ مسلمانوں پر تو کافروں نے مظالم ڈھائے اور جب ان ظالموں کے ترکش میں کوئی تیرِ ستم باقی نہ رہا تو اکثر اسلام کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ ان مظالم کی داستان بڑی طویل اور دردناک ہے۔ یہاں صرف چند ایک واقعات کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قاضی محمد سلیمان منصوری کی تالیف "رحمۃ اللعالمین" سے ماخوذ ہیں :

بلال حبشیؓ تھے، امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب امیہ نے سنا کہ غلام مشرف بہ اسلام ہو گئے تو گوناگوں عذاب ان کے لیے ایجاد کیے۔ حضرت بلالؓ کی گردن میں رسی ڈال کر لڑکوں کے ہاتھ میں دی جاتی اور وہ مکہ کی پہاڑیوں میں ان کو لیے پھرتے۔ تپتی ہوئی ریت پر انہیں لٹا دیا جاتا۔ اور گرم گرم پتھر ان کی چھاتی پر رکھ دیا جاتا۔ ان کی مشکیں باندھ کر دھوپ میں بٹھا کر لکڑیوں سے پیٹا جاتا۔ حضرت بلالؓ ان سب حالتوں میں ثابت قدم رہے اور اَحد اَحد کے نعرے لگاتے رہے۔

عمارؓ اور ان کے والد یاسرؓ اور ان کی والدہ سمیہ مسلمان ہو گئے تھے۔ ابوجہل درپے آزار ہو گیا اور ان پر طرح طرح کے عذاب ڈھائے۔ بدبخت ابوجہل نے بی بی سمیہ

کے اندامِ نہانی میں نیزہ مارا اور اُسے جان سے مار ڈالا۔

حضرت عثمانؓ بن عفان کے اسلام لانے کی خبر اُن کے چچا کو ہوئی تو سخت برہم ہوا۔ ظالم چچا حضرت عثمان کو کھجور کی صف میں لپیٹ کر باندھ دیتا اور نیچے سے دھواں دیا کرتا۔ بعض صحابہ کو قریش گائے اونٹ کے کچے چمڑے میں لپیٹ کر دھوپ میں پھینک دیتے تھے۔ اور بعض لوہے کی زرہ پہنا کر جلتے جلتے پتھروں پر گرا دیا کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے تھے تاکہ رات کے اندھیرے میں آپؐ کے پاؤں زخمی ہوں۔ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے دروازے پر گندگی کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ نماز پڑھ رہے تھے، عقبیٰ بن ابی معیط آیا، اُس نے اپنی چادر کو لپیٹ کر رسی جیسا بنایا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو چادر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں ڈال دیا اور پیچ پر پیچ دینے شروع کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اطمینان قلب کے ساتھ سجدہ میں پڑے ہوئے تھے کہ حضرت صدیقؓ آئے انہوں نے دھکے دے کر عقبہ کو ہٹایا۔ اس پر چند شریر حضرت ابوبکرؓ سے لپٹ گئے اور اُن کو بُری طرح زدوکوب کیا۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، کفار بھی صحنِ کعبہ میں جا بیٹھے۔ ابوجہل بولا آج شہر میں فلاں جگہ اونٹ ذبح ہوا ہے اوجھڑی پڑی ہے۔ کوئی جا کے اٹھا لائے۔ عقبہ اٹھا اور نجاست سے بھری اوجھڑی اٹھا لایا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو نجاست سے بھری ہوئی اوجھڑی اُن پر رکھ دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے اللہ کی جانب متوجہ تھے۔ کچھ خبر نہ ہوئی۔ اتنے میں معصوم فاطمہؓ آگئیں۔ باپ کی پشت سے اوجھڑی کو پرے پھینک دیا اور ظالموں کو بُرا بھلا کہا۔

اب کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زر و مال اور جاہ و منصب کا لالچ دینا شروع کیا۔ جب یہ تدبیریں بھی کارگر نہ ہوئیں تو سب قبیلوں کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پاس گئے اور بتوں کی توہین سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کو باز رکھنے کی درخواست کی۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور سمجھایا!
"بت پرستی کا رد نہ کرو، ورنہ میں تمہاری کچھ مدد نہ کر سکوں گا۔"
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"چچا جان اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر رکھیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا۔ اور خدا کے حکم سے ایک حرف بھی کم نہ کروں گا۔ اس کام میں خواہ میری جان بھی جاتی رہے۔"

جب کفار نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اذیتوں کے باوجود برابر تبلیغ کیے جا رہے ہیں تو انہوں نے آپ کو قبیلہ بنی ہاشم سے جو ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا، مکمل مقاطعے کا فیصلہ کر لیا۔ اور بنی ہاشم سے لین دین، رشتہ ناطہ، میل ملاپ سب بند کر دیا، گلی بازار میں اُن کے چلنے پھرنے پر پابندی لگا دی گئی اور اس معاہدہ کو کعبہ میں لٹکا دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا قبیلہ گھر بار چھوڑ کر پہاڑی کی گھاٹی میں محصور ہو کر رہنے لگے۔ کفار نے اجناس خوردنی کا جانا بند کر دیا۔ بنی ہاشم کے بچے بھوک کے مارے اس قدر روتے کہ اُن کی آواز دور دور تک سنائی دیتی۔ تین برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قبیلہ سمیت پہاڑی کی گھاٹی کے اندر محصور رہے، جو مسلمان مکہ میں تھے وہ بھی اپنے گھروں میں قیدی بن کر رہنے لگے۔

تین برس تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سختی کو نہایت صبر و استقلال سے برداشت کیا۔ جب کافروں نے گھاٹی پر سے پہرے اٹھا لیے اور دیمک نے کعبہ میں لٹکے ہوئے معاہدہ کے کاغذ کو کھا لیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور پھر واعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کفار نے اب مظالم کی انتہا کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مدینہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہجرت بھی آسان بات نہ تھی قریش مسلمانوں کا راستہ روکتے، مال و اسباب چھینتے اور زد و کوب کرتے۔ جب مسلمان مکہ میں گنتی کے رہ گئے اور مشہور صحابہ میں سے صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ باقی رہ گئے تو قریش مکہ نے غنیمت جانا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا

منصوبہ تیار کیا۔

جب رات کی تاریکی میں بدبختوں نے بیت النبیؐ کو آ گھیرا تو حضورؐ نے اپنے پیارے بھائی علیؓ سے فرمایا:

"تم میرے بستر پر میری چادر لے کر سو رہو، ذرا فکر نہ کرنا، کوئی شخص تمہارا بال بیکا نہ کر سکے گا۔"

حضرت علیؓ نہایت بے فکری سے تلواروں کے سائے میں سو گئے اور حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر "غارِ ثور" کی طرف چل دیے۔ غارِ ثور مکہ سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی چڑھائی سر توڑ ہے۔ راستہ سنگلاخ تھا۔ نکیلے پتھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے نازک کو زخمی کر رہے تھے اور ٹھوکریں لگنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ آخر ایک غار تک پہنچے۔ ابوبکرؓ نے نبی اللہ علیہ وسلم کو باہر ٹھہرایا، خود اندر جا کر غار کو صاف کیا۔ تن کے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر غار کے روزن بند کیے اور پھر عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئیں۔ دونوں تین روز تک اسی غار میں رہے۔ غار سے نکل کر جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت ابوبکرؓ قبا پہنچے تو حضرت علیؓ بھی پا پیادہ سفر کرتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پہنچ گئے۔

ان سوشلسٹوں سے کون پوچھے کہ وہ کون سی طاقت تھی جو ان حق پرستوں کو انتہائی سنگین اور ناقابلِ برداشت حالات میں ثابت قدم رکھے ہوئے تھی۔ سوشلسٹ اس کا جواب "روٹی" دیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنا سب کچھ راہِ حق میں لٹا دیا تھا۔ ان کی نگاہ میں سیر روٹی تو کیا اپنی جانِ عزیز بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ ان حق پرستوں میں اکثر وہ لوگ شامل تھے جو اسلام لانے سے قبل متمول تھے۔ لیکن جب اس جہان سے رخصت ہوئے تو گھروں میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے نام کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ خدا نے ان کو حکومت بھی دی، بے حد حساب مالِ غنیمت بھی ہاتھ لگا، مال و متاع جمع کرنے کے مواقع بھی ملے لیکن کبھی نانِ جویں سے آگے نہ بڑھے۔ ؎

رسمِ عاشق نیست بایک دل، دو دلبر داشتن
یا ز جاناں یا ز جاں بایست دل برداشتن

باب ۱

اشتراکیت کی عملی صورت

لادینی نظام اور چنگیزیت

تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں خواہ وہ جہالت اور تاریکی کا زمانہ کہلائے یا علم و روشنی کا، انسان کی تقدیر انسان کے ہاتھوں بد سے بدتر رہی ہے۔ ازمنہ قدیم کی غیر مہذب مطلق العنان بادشاہتوں سے لے کر آج کی مہذب جمہوری، فسطائی اور اشتراکی ریاستوں میں انسان برابر اسیر پنجۂ صیاد چلا آرہا ہے۔

عہدِ قدیم کا صیاد اپنی ہوسِ صید افگنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا تھا وہ ریا آشنا تھا، نہ منافقت آگاہ، نہ دام نہ دانۂ دام، وہ علی الاعلان کھلے میدان میں تیر اندازی کے جوہر دکھاتا تھا اور صیاد کہلانے میں باک محسوس نہیں کرتا تھا۔ عہدِ جدید کا صیاد ہر درجہ پُرکار ہے۔ اس کے ہاں دام بھی ہے اور دانۂ دام بھی۔ دام اس درجہ دلکش اور اس درجہ ہمرنگِ زمیں کہ فنکارانہ صلاحیتوں کا شاہکار۔

فرانس میں اقتصادی ناہمواریوں کی بنا پر متوسط طبقہ نے شاہی خاندان اور اُمرا کے خلاف کامیاب بغاوت کی اور بادشاہت کے خلاف بغاوت کرکے خود حکومت پر قبضہ کر لیا۔ موروثی ملوکیت کا دَورِ استبداد ختم ہوا تو عوام نے سوچا کہ ظلم کا ہاتھ کٹ گیا ہے اور امن و مساوات کا سورج طلوع ہونے والا ہے لیکن ہوا یہ کہ نہ اندھیری رات ختم ہوئی اور نہ سحر کا اُجالا نمودار ہوا۔ متوسط طبقہ نے بتدریج پرانے سرمایہ داروں کی جگہ لے لی اور خود بہت بڑے سرمایہ دار بن گئے۔ نظامِ حکومت میں ضرور تبدیلی ہوئی لیکن عوام کی تقدیر جوں کی توں رہی۔

ان آبلوں سے پاؤں کی اُکتا گیا تھا میں
جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر (غالبؔ)

لادینی نظام کی رُوح چنگیزیت ہے۔ چنانچہ اس کا تشکیل دیا ہُوا ہر نظام انسانیت کش ثابت ہُوا ہے۔ جس نظام کی بنیاد لادینیت پر ہو اور نتیجۃً کسی بالا تر قوت کے آگے جواب دہی کے تصور سے عاری ہو۔ اُس نظام کے خداوندوں سے مکر و فریب اور تشدد و بربریت کے سوا کس اور بات کی کیا توقع ہو سکتی ہے ؎

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

چنگیزیت نت نئے روپ دھار کر خون سے اپنی پیاس بجھانے کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ آج چنگیزیت پوری جمعیت کے ساتھ اشتراکیت کے روپ میں دنیا پر مسلّط ہے۔

چنگیزیت کی تکمیل

روسی عوام اندرونی خلفشار اور پہلی جنگ کی تباہ کاریوں سے تنگ آئے ہوئے تھے اور ملک میں قحط پڑا ہُوا تھا۔ لینن نے روٹی، کپڑا اور صلح کا نعرہ لگایا جو بڑا پُرکشش ثابت ہُوا اور لوگ جوق در جوق بالشویکوں کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں اشتراکی حکومت قائم ہو گئی۔

اشتراکی انقلاب انسانی خون کے سمندر سے نہا کر نمودار ہُوا اور جب تک اشتراکیت قائم ہے نسلِ انسانی کو خون کے غسل ملتے رہیں گے۔ پروفیسر سوروکن انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> "انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) میں انقلابی عدالتوں کے ذریعے کل ۱۷ ہزار افراد کو تختہ دار پر لٹکایا گیا اور ۲۵ سے ۴۰ ہزار افراد انقلابی جنون کا شکار ہوئے .... جو لوگ انقلابی عدالت کے سُرخ کرداکے (۱۹۲۲ء – ۱۹۱۷ء) کو بلاواسطہ شکار ہوئے۔ ان کی تعداد محتاط ترین اندازے کے مطابق ۷ لاکھ ہے ...... اس میں خانہ جنگی

کی نذر ہونے والے افراد اور انقلاب کے بالواسطہ نشانہ بننے والے لوگ شامل نہیں ہیں۔ اگر ان تمام صورتوں کو شامل کر لیا جائے تو ایک کروڑ پچاس لاکھ سے لے کر ایک کروڑ ستر لاکھ افراد کی جانیں انقلاب کے بُت پر بھینٹ چڑھا دی گئیں .... عملِ تطہیر شب و روز کا عمل بن گیا، اور قتل و غارت روزمرہ کا معمول۔"

Sorokim Pitrim A ;

'The crisis of our Age'' pp. 229-231

عملِ تطہیر اس درجہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھا کہ غیر اشتراکیوں یا عام اشتراکیوں کا تو کیا ذکر انقلابِ روس کے بانی بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے۔

لینن نے ابتدا ہی سے ایک جماعتی حکومت کے قیام کی کوششیں تیز کر دیں۔ ٹراٹسکی اور اس کے ساتھیوں نے اختلافِ رائے کا اظہار کیا۔ کئی سالوں تک کمیونسٹ پارٹی میں کشمکش جاری رہی۔ ۱۹۲۷ء میں ٹراٹسکی کو جماعت سے نکال دیا گیا۔ ٹراٹسکی کی جلاوطنی کے بعد ایسے تمام افراد کو مقدمہ چلائے بغیر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جن پر ٹراٹسکی کا ہم خیال ہونے کا ذرا سا شبہ ہو سکتا تھا۔ اگست ۱۹۳۶ء میں زنوویو (Zinovier) اور کیمینیو (Camenev) پر مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت دی گئی۔ یہ دونوں ٹرائے امویریٹ (Triumoirate) کے رکن تھے جو لینن کی موت کے بعد سٹالن کی سرکردگی میں روس کا نظم و نسق چلانے کے لیے قائم کی گئی تھی۔

مختلف اوقات میں بالشویکی تنظیموں، ٹریڈ اور لیبر یونینوں کے عہدہ داروں اور حکومت کی کلیدی اسامیوں پر فائز عظیم اشتراکی لیڈروں کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ ۱۹۲۴ء کی جنگی کونسل کے تمام ممبروں، ۱۹۳۶ء کی مرکزی کابینہ کے اکثر وزیروں، مرکزی انتظامیہ کمیٹی کے تقریباً تمام سربراہوں، کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی تنظیم کے بیشتر سیکرٹریوں، صوبائی تنظیم کے تمام سیکرٹریوں اور ۱۹۳۶ء کے دستور کا مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی کے بیشتر اشتراکی لیڈروں، ٹریڈ اور لیبر یونینوں کے بے شمار سیکرٹریوں اور عہدہ داروں کو غداری اور جاسوسی کے الزام میں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں

مارشل تخاچیوسکی (Tukhiacheuasky) اور دوسرے سات جرنیلوں کو خفیہ مقدمہ چلا کر موت کی نیند سُلا دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہزاروں چھوٹے بڑے جرنیلوں اور افسروں کو قتل یا برطرف کر دیا گیا۔

لیوس ممرڈ لکھتا ہے:

"سوشلزم کی انسان دوستی کا چہرہ، اُس کی مادی خوش حالی اور جمہوری اخوّت کا خواب جنگ اور استبداد کے آہنی خود کے پیچھے چھپ گیا۔ لینن نے مارکس کے نظریات کو پوری وفاداری کے ساتھ عمل میں لاتے ہوئے اُن تمام طبقوں اور تنظیموں کا صفایا کر دیا جو کسی طرح بھی شریکِ اقتدار ہو سکتے تھے .... جاسوسی، بغیر مقدمہ چلائے سزا دینا، دور دراز کے انسانی باڑوں میں لوگوں کو مخفی طور پر قید رکھنا، اُنہیں قتل کر دینا، جبری مشقت لینا ...... اشتراکیت کی ان تمام نئی خصوصیات نے اصل عزائم کو خاک میں ملا دیا .... آخر کار خود اُن لوگوں کی اکثریت، جن کی بدولت انقلاب برپا ہوا تھا غنڈے قرار پائی اور اُنہیں غداروں کی حیثیت سے سزا دی گئی .... اگر ان انقلابیوں پر جو الزام لگائے گئے تھے وہ درست تھے تو یہ بات خود انقلاب اور اُس کے نقطۂ آغاز پر بدنما دھبّہ ہے۔ اور اگر یہ لوگ بے گناہ تھے تو خود اُن کے بنائے ہوئے نظام .... کے مکروہ و مذموم ہونے کی دلیل ہے۔"

Mumfund, Lewis; The condition of Man
p.p. 340—341

جس نظام میں انسان کو جنگلی جانور سے بھی ذلیل خیال کیا جائے اور استبداد و بربریت کو دستوری حیثیت حاصل ہو جائے، اُس نظام میں عدالتوں کا صرف یہ کام رہ جاتا ہے کہ استبدادی نظام کے آقاؤں کی مرضی کے مطابق احکام سنائے جائیں اور لوگوں کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع نہ دیا جائے۔

روس میں جگہ جگہ قید خانے اور انسانی باڑے کھل گئے اور ملک پورے کا پورا عذاب خانہ بن کر رہ گیا۔ لوگ سائبیریا کا نام سن کر کانپ اُٹھتے تھے اور وہاں جانے پر موت کو ترجیح دیتے۔ ہر طرف ہراس، سراسیگی اور دہشت و بربریت کا عالم طاری تھا، سارے ملک میں جاسوسی کا جال بچھا ہوا تھا، ہر فرد کو یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ ابھی کوئی خفیہ پولیس کا آدمی اُسے شانے سے تھامے گا اور ایسی جگہ لے جائے گا جہاں سے کبھی اپنے گھر واپس نہیں آسکے گا۔

اشتراکیت عوام دوستی کے نام پر وجود میں آئی لیکن عوام کو ظلم و ستم کی چکی میں پیس کر رکھ دیا اور استبداد کو آہنی تقدس دیا۔ لینن اس امر کا اعتراف بڑے غیر مبہم الفاظ میں کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

"سیاسی اعتبار سے ایک قسم کا تشدد قائم کیے بغیر چارہ نہ ہوگا تاکہ جو دشمن باقی ہیں اُن پر قابو رہے۔"

(لینن ترجمہ ڈاکٹر اشرف صفحہ ۱۵۲)

پروفیسر ہیکو اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ تاریخ عالم میں اشتراکی استبداد کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ لکھتا ہے:

"بالشوزم اپنی ڈکٹیٹرشپ کے ساتھ ایک استبداد ہے جس کی شدت قدیم استبداد سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔"

(پروفیسر ہیکو: ریلیجن انڈر دی سوویٹ صفحہ ۱۸۴)

اے گارڈن لکھتا ہے:

"کمیونزم نے اپنے تخیل پرستی کے دَور میں ...... محبت اور ہمدردی کی تعلیم دی .... لیکن جب اس تحریک پر سیاسی رنگ غالب آگیا .... تو اس نے بد اخلاقی اور محبت کے بجائے نفرت کا رویہ اختیار کیا جس کی سب سے شدید شکل لینن ازم ہے۔"

(اے گارڈن: "کمیونزم ان ماسکڈ" صفحہ ۲۰۸)

اے بابانواجو کامنٹرن کا پہلا سیکرٹری تھا، لکھتا ہے:

"وہ تصور جس نے عالمِ اقوام میں عدیم النظیر بہادری کی روح بیدار

کردی تھی۔ اب ایک ایسا نظام بن گیا ہے، جس میں بد دیانتی، ظلم و استبداد اور دغا بازی کا دَور دَورہ ہے"۔

(رائے بابا لوا: "باغی کی حیثیت سے میری زندگی" صفحہ ۲۱۹)

انسانیت کُش اشتراکی نظام کی رُوح ہے۔ اس لیے ستم فرمائی کے لیے کوئی حد یا معیار مقرر نہیں۔ ملزم، ملزم کو جاننے والا، ملزم کی مخبری نہ کرنے والا، ملزم کی بیوی، بچے، عزیز و اقارب سب سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ اور نشانۂ ستم بنتے ہیں اور کسی کو فریاد کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ فریاد تو اُس نظام میں معنی رکھتی ہے جس میں داد خواہی اور داد رسی کا دستور ہو۔ جس نظام کی بنیاد انسانی قدروں کی مکمل تکذیب پر قائم ہو، اُس نظام میں گھُٹ کے مر جانے کے سوا کیا چارہ ہے۔ لینن نے اپنے ایک دوست کو لکھا:

"اخلاق و تکریم کے آئین کا ہمارے نزدیک کوئی وجود نہیں"۔

بربریت ہر اشتراکی دَور میں بلا امتیاز پائی جاتی ہے، چین میں ثقافتی انقلاب پر آئے دن خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ البانیہ، بلغاریہ، چیکوسلاویکیہ وغیرہ میں برابر عملِ تطہیر جاری ہے۔ مخالفوں کو گرفتار کرنے، قید خانوں میں بند کرنے اور گولیوں سے اڑانے کا بازار گرم رہتا ہے۔

روس کی منصوبہ بندی کا محور

روس میں زندگی کے ہر شعبہ میں اجتماعیت کا ایسا نظام رائج ہے جس پر حکومت کا مکمل کنٹرول ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتی میدان میں روس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے لیکن زراعت اور دوسرے اشیائے صَرف کے شعبوں میں حالات نہایت مایوس کُن ہیں۔ حالانکہ زراعت ہی وہ شعبہ ہے جس سے خوراک حاصل کی جاتی ہے اور جس پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے۔ روس کی تمام تر توجہ بھاری مشینوں کی تیاری پر لگی ہوئی ہے۔ سرمایہ اور افرادی قوت کا بیشتر حصہ اسی صیغہ پر لگایا جاتا ہے۔ زمین کی نجی ملکیت کے خاتمے نے کاشت کار سے وہ لگن اور داعیہ سلب کر لیا ہے جو زرعی پیداوار کے لیے قوتِ محرکہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جاگیرداریوں اور

زمینداریوں کا خاتمہ تو درست بات تھی، لیکن کاشت کاروں سے زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھین لینا زراعت کے لیے بیحد نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔

دراصل اشتراکیوں کو تو جہاں گیری کے لیے مہلک ترین سامان جنگ کی ضرورت ہے۔ لینن نے بر سر اقتدار آنے کے بعد صاف الفاظ میں کہا تھا کہ اشتراکیت سے مراد روس اور برقی ترقی ہے۔

چنانچہ روس میں دن رات ایٹم بم اور میزائل تیار کیے جا رہے ہیں۔ اشتراکیوں کی منصوبہ بندی کا اصل الاصول تو عوام کی خوشی اور خوش حالی ہونا چاہیئے تھا نہ کہ اسلحہ سازی اور استعمار کوشی، کیونکہ اقتدار میں آنے سے پہلے انہوں نے عوام کو مادی راحتوں اور مسرتوں کا مژدۂ جانفزا سنایا تھا اور اقتصادی خوش حالی کے سبز باغ دکھائے تھے۔

اجتماعی کاشت کے نظام کا نفاذ

۱۹۱۷ء میں اشتراکی حکومت قائم ہوتے ہی زمینوں کو اصولی طور پر قومی ملکیت میں لے لیا گیا، لیکن عملی طور پر زمینوں کو کسانوں کی انفرادی ملکیت میں رہنے دیا گیا۔ البتہ جاگیرداروں اور زمینداروں سے عملاً زمینیں چھین کر کاشت کاروں میں تقسیم کر دی گئیں۔

دوسرا مسئلہ زمین کی اجتماعیت بندی تھا، لیکن زمین کو کسانوں کی نجی ملکیت سے لے کر اجتماعی ملکیت میں لانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کسانوں کو اپنی زمینوں سے فطری لگاؤ ہوتا ہے اور وہ کسی صورت اس سے الگ ہونا گوارا نہیں کرتا۔ لینن نے جو معاملے کی نزاکت کو سمجھتا تھا اپنی زندگی میں اس طرف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس کام کے لیے اسٹالن جیسے سنگدل انسان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اسٹالن نے بر سر اقتدار آنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں سرکاری سطح پر اجتماعی کاشت کاری کے نفاذ کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

زمین کی اجتماعیت بندی اور انسانی خون کی ارزانی

کسان اپنی زمین اور اپنے مویشی اجتماعی ملکیت میں دینے کے لیے تیار نہ تھے جس نظام میں رات کی تنہائیوں میں دل کی بات زبان پہ لانے کی اجازت نہ ہو۔ اُس نظام میں حکم عدولی کی سزا ظاہر ہے۔ جن کاشت کاروں نے اپنی زمین اجتماعی ملکیت میں دینے سے انکار کیا، اُن پر وہ مظالم ڈھائے گئے اور وہ عذاب نازل کیے گئے کہ پوری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس ملک گیر خونی مہم میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں، بے شمار دیہات اور بستیاں بے چراغ ہو گئیں، راستے لاشوں سے پٹ گئے، بھیڑیوں اور گرگوں کی بن آئی۔ انسانی گوشت اور خون کی اس قدر فراوانی چنگیز خاں سے پہلے یا بعد کب دیکھنے میں آئی تھی۔ نہایت محتاط اندازے کے مطابق پچاس لاکھ ایسے افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ جن پر اجتماعی کاشت کاری کی مخالفت کا شبہ تھا۔ اس کے علاوہ لاکھوں مخالفین کو سائبیریا کے بیگار کیمپوں میں پس پس کر مرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔

لاتعداد کاشت کاروں کی موت اور سابقہ زرعی نظام کی تباہی سے ملک میں قحط پھیل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کاشت کار اشتراکی حکومت کے مظالم سے بچ گئے وہ قحط کا شکار ہو گئے۔

مختصر یہ کہ زراعت کو اجتماعی کھیتوں میں منتقل کرنے کی خونیں مہم میں ایک کروڑ انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اشتراکی قائدین اس امر کا اعتراف کھلے بندوں کرتے ہیں۔ چرچل کے اس استفسار پر کہ دوسری عالمی جنگ میں روس کو کتنی جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ اسٹالن نے کہا دوسری جنگ میں جانوں کا ضیاع کیا معنی رکھتا ہے۔ ہم نے زراعت کو اجتماعی کھیتوں میں تبدیل کرتے وقت دوگنا قربانی دی تھی۔ دوسری عالمی جنگ میں روس کے تقریباً پچاس لاکھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔

اجتماعی کاشت کاری کی ناکامی

گزشتہ پچاس ساٹھ سالوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لینے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے

کہ اجتماعی کاشت کاری کا نظام بُری طرح ناکام رہا ہے۔ اس ناکامی کے کچھ بنیادی اسباب ہیں:

صنعتی اداروں میں تقسیم کار کی بدولت ہر فرد کی پیداواری صلاحیت کا اندازہ لگانا ممکن ہے۔ اس کے برعکس اجتماعی کاشت کاری میں تقسیم کار کے عمل کو اپنانا مشکل ہے، کیونکہ اجتماعی کھیتوں میں بہت سے کاشت کار مل کر ایک ہی قسم کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ لہٰذا اس امر کا اندازہ لگانا ناممکن ہوتا ہے کہ فرداً فرداً کس نے کتنا اور کیسا کام کیا ہے۔

اجتماعی کھیتوں میں کاشت کرنے والے کاشت کاروں کو کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی طرح اجرت نہیں دی جاتی۔ ہر فصل کے اختتام پر اجتماعی کھیتوں کی انتظامیہ کچھ غلہ بیج کے طور پر رکھ کر پیداوار کا بیشتر حصہ حکومت کے ہاتھوں فروخت کر دیتی ہے۔ موصولہ رقم سے کھیتوں کے لیے زرعی مشینوں اور کھاد وغیرہ کے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں، اس کے بعد جو غلہ بچ جاتا ہے وہ کاشتکاروں میں ان کے کام کے دنوں کے تناسب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ تقسیم ہونے والی مقدار ہر سال کم و بیش ہوتی رہتی ہے اس لیے کاشت کار کو ہر سال یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں اس کا حصہ کم نہ ہو جائے۔

زمین کی زرخیزی یکساں نہیں ہوتی، کسی کھیت کی زمین زیادہ زرخیز اور کسی کی کم ہوتی ہے۔ کم زرخیز زمین والا کاشت کار خواہ کتنی محنت کرے اُسے حصہ کھیت کی پیداواری بچت کے حساب ہی سے ملتا ہے جب کہ زیادہ زرخیز کھیتوں کے کاشت کار کم محنت کر کے زیادہ اُجرت حاصل کر لیتے ہیں۔

صنعتی اداروں میں محنت کشوں کو کاشت کاروں کی نسبت بہتر اُجرت ملتی ہے۔ اس لیے محنت کار صنعتی اداروں میں کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ یوں بھی روس میں اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں روزافزوں صنعتی ترقی کے باعث بالغ جسمت افراد کی مانگ برابر بڑھتی رہتی ہے۔ اس لیے جوان اور صحت مند افراد کھیتوں کو چھوڑ کر صنعتی اداروں میں چلے جاتے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کھیتوں میں کام کرنے کے لیے کمزور مرد اور عورتیں اور نابالغ بچے ہوتے ہیں۔

اجتماعی کاشت کاری میں افراد کا اجتماع تو ممکن ہے لیکن دلی لگاؤ اور حقیقی تعاون ناپید ہوتا ہے۔

روس میں زیرِ کاشت رقبہ کا ۵ء۹۴ فی صد سرکاری کھیتوں پر مشتمل ہے۔ اور ۱ء۹۴ فی صد اجتماعی کھیتوں پر اس طرح کل زیرِ کاشت رقبہ کا ۶ء۹۸ فیصد اجتماعی تحویل میں ہے اور صرف ۱ء۴ فی صد نجی ملکیت میں ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کل پیداوار کا ۳۲ فی صد اس نجی ملکیت کے برائے نام رقبہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اجتماعی کاشت کاری کی ناکامی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ تمام اشتراکی ممالک اجتماعی کاشت کاری کے تلخ نتائج سے دوچار ہیں اور خوراک کا مسئلہ ان ممالک کے لیے بحران کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس امر کی تصدیق روس امریکہ کے حالیہ معاہدوں سے ہوتی ہے جن کی رُو سے روس نے امریکہ سے لاکھوں ٹن غلہ درآمد کیا ہے۔

ستم تو یہ ہے کہ اجتماعیت بندی کی بدولت جہاں پیداوار میں ناقابلِ تلافی کمی واقع ہوئی ہے، وہاں کاشت کار اپنی نجی ملکیت سے محروم ہو کر اُجرت کے معاملہ میں ہمیشہ کے لیے ایک غیر یقینی دولت کا شکار بن گیا ہے۔ اُسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ فصل کے آخر میں اس کی قسمت کیا کُل کھلاتی ہے، جس کھیت پر اس کے شب و روز مشقت کرتے گزرتے ہیں۔ اُس کھیت یا کھیت کی پیداوار پر اُس کا کوئی حق نہیں۔ ریاست کی قائم کردہ انتظامیہ مختارِ کُل ہے۔ اور کاشت کار اس کے سامنے مجبور و بے بس ہے۔ افسوس تو اس امر کا ہے کہ جس نظام نے کاشت کار کو سب کچھ اس وعدے پر چھینا کہ اُس کی زندگی پہلے سے بہتر ہو گی۔ اُسی نظام نے اس کاشت کار کو جو خود کبھی مالک تھا، خواہ زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کا ہی، زرخرید غلام کے درجے سے بھی نیچے گرا دیا ہے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر گوشۂ گندم کو جلا دو

(اقبالؔ)

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ:

"میں مجبور ہوں کہ بالشوزم کو دو اسباب کی بنا پر رد کر دوں: پہلا یہ کہ انسانیت کو اشتراکیت کو بالشویکی طریقوں سے حاصل کرنے کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ ہولناک ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اتنی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد بھی سمجھتا ہوں کہ جو نتیجہ حاصل ہوگا وہ، وہ نہیں ہوگا جس کا دعویٰ بالشویکی کرتے ہیں۔"

اشتراکیت اور مزدور

تاریخ شاہد ہے کہ اہلِ ہوس انسانی ہمدردی کے نام پر انسانوں کو برابر فریب دیتے آئے ہیں۔ اقتدار میں آنے سے پہلے انسانی حقوق کے تحفظ کا یقین دلایا جاتا ہے، جبر و تشدد کی مذمت کی جاتی ہے، قانون کی حکمرانی کے نعرے لگائے جاتے ہیں، غربت ختم کرنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، مزدوروں اور کسانوں کو اقتصادی خوش حالی کا مژدہ سنایا جاتا ہے۔ یہ نعرے اور وعدے اس قدر دلکش اور دلفریب ہوتے ہیں کہ بے چارے عوام یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اُن کے دل کی بات کہی جارہی ہے۔ ان دلکش نعروں پر زورِ خطابت سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
(غالبؔ)

پروپیگنڈے کے ذریعے ان وعدوں اور نعروں کی اس حد تک تشہیر کی جاتی ہے کہ یہ زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں اور لوگ گلی کوچوں میں دہراتے پھرتے ہیں۔

اشتراکیوں نے پرولتاری حکومت کے قیام اور اقتصادی خوش حالی کا نعرہ بلند کیا تھا، لیکن اقتدار میں آنے کے بعد عوام سے کیے ہوئے تمام وعدے نقش برآب ثابت ہوئے۔ اشتراکی تو یوں بھی کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہیں اس لیے ان پر وعدہ خلافی کا الزام بے معنی ہے۔ تشدد اور منافقت اُن کے بنیادی

اصول ہیں۔

اشتراکی، غیراشتراکی ملکوں میں حریت و مساوات کے راگ الاپتے ہیں۔ ٹریڈ اور لیبر یونینوں میں گھس جاتے ہیں۔ اور مزدوروں کو مراعات کے حصول کی خاطر سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکاتے ہیں، ہڑتالیں اور مظاہرے کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، جب ملک میں ابتری پھیل جاتی ہے تو انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر غیراشتراکی ملکوں کے مزدور انہیں پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے اشتراکی ملکوں کے مزدوروں کی حالتِ زار کا مشاہدہ کریں تو اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اشتراکی ملکوں میں مطالبات پیش کرنا یا حقوق کے لیے ہڑتال کرنا جرم ہے۔ ان ملکوں میں یونینوں کا کام انتظامیہ کا ہاتھ بٹانا ہے اور بلاچون وچرا اُن کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔

۸۔ جولائی ۱۹۳۳ء کے اجلاس میں مرکز ٹریڈ یونین کونسل کے سیکرٹری نے ٹریڈ یونین کے دائرۂ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"آج بھی فیکٹریوں میں کچھ کامریڈ ایسے ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اجرت کے تعین میں ٹریڈ یونین کو بھی اتنا ہی دخل ہونا چاہیئے جتنا کہ انتظامیہ کو ہے۔ یہ تصوّر بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ یونین انتظامیہ کی جگہ لے لے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسا کرنے سے انتظامیہ کمزور ہو جائے گی۔ اور اس کے فرائض منصبی کی بجا آوری میں مداخلت ہوگی، چنانچہ اس کو لازماً ختم ہونا چاہیئے۔"

روس میں زیادہ اجرت کا مطالبہ رجعت پسندی اور مزدور دشمنی کی دلیل ہے۔ نویں ٹریڈ یونین کنونشن کے سامنے مرکزی ٹریڈ یونین کی پیش کردہ رپورٹ میں لکھا ہے:

"اب جو لوگ اُجرت بڑھانے اور مزدوروں کے لیے سہولتیں حاصل کرنے کی بات کرتے ہیں، وہ مزدوروں کے دشمن ہیں۔ اب اُجرت

کا تعین بھی انتظامیہ کا کام ہے، مزدوروں کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔"

جمہوری ملکوں میں اشتراکی، مزدوروں کی صحت کا رونا روتے ہیں اور اوقاتِ کار میں تخفیف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑے اشتراکی ملک روس میں ایک باقاعدہ فرمان کے ذریعے ڈاکٹروں کو حکم دیا گیا کہ وہ عورتوں کو مخصوص ایام میں رخصت دینے سے کلیتہً اجتناب کریں کیونکہ عورتیں بھی اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اشتراکی ملکوں میں بچوں، عورتوں اور مردوں کو ایک لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ ۱۲ سے ۱۵ گھنٹے تک یومیہ جان لیوا مشقت تو عام بات ہے۔ بعض اوقات دو دو تین تین دن لگاتار کام کرنا پڑتا ہے ان مزدوروں میں بارہ بارہ سال کے بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔

اسٹالن کے زمانے میں جبری محنت کا سفاکانہ نظام بڑے وسیع پیمانے پر رائج تھا مختلف رپورٹوں اور کتابوں میں داستان ستم کی بڑی سنسنی خیز اور زہرہ گداز تفصیلات ملتی ہیں۔ خود خروشچیف نے اپنی تاریخی تقریر میں اسٹالن کے جبری محنت کے نظام کی مذمت کی ہے۔

اسٹالن کے دورِ استبداد میں ہزاروں افراد کو رات کی تاریکیوں میں سائبیریا پہنچا دیا جاتا تھا، جہاں وہ جبری محنت کے کیمپوں میں نظر بند رکھے جاتے تھے۔ ان کیمپوں کا ماحول اس قدر ہیبت انگیز اور وحشت اثر تھا کہ آدمی ان کے خیال ہی سے کانپ اٹھتا تھا۔ ان کے چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ اوّل تو ان کیمپوں سے بھاگ نکلنا کوئی آسان بات نہ تھی لیکن اگر کوئی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو برف کے بے رحم ہاتھ اس کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیتے۔

جبری محنت کے کیمپوں میں محبوس مزدوروں کو بھوکا اور ننگا رکھا جاتا۔ ان بدنصیبوں کی ساری عمر سختیاں جھیلتے اور دکھ اٹھاتے گزر جاتی۔ یہ لوگ ظلم سہتے سہتے بالکل بے حس ہو جاتے تھے۔

اشتراکیت کی نظر میں انسان کی حیثیت

اشتراکیت نے انسان کو جانوروں اور مشین کے بے جان پرزوں سے بھی پست تر مقام پر لا پھینکا ہے۔ جانور دو طرح کے ہیں: جنگلی اور پالتو۔ جنگلی جانور آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں اور جب چاہتے ہیں جنگل میں ہر طرف بکھری ہوئی گھاس سے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ پالتو جانور کی جو تواضع ہوتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، عمدہ سے عمدہ خوراک ملتی ہے، تیل سے مالش کی جاتی ہے باقاعدہ نہلایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح اور شام سیر کرائی جاتی ہے، مشین کو بھاری مقدار میں ایندھن دیا جاتا ہے، باقاعدہ مرمت اور صفائی کی جاتی ہے، شکست و ریخت سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لائی جاتی ہے۔ دراصل اشتراکیت کی نظر میں انسان ہی سب سے کم قیمت شے ہے۔ یہ ادنیٰ ترین عامل پیدائش ہے جس کو نہ تو مناسب اور باقاعدہ خوراک کی ضرورت ہے اور نہ صحت و صفائی کی۔ اشتراکیوں کے خیال میں نسلِ انسانی تو بلا طلب روز افزوں ہے لیکن مشین سازی محنت، دقت اور زرِ کثیر کے بغیر ممکن نہیں۔

تمام اشتراکی ممالک بالخصوص روس کی تمام تر بھاری صنعت اور فوجی قوت کی تعمیر پر مرکوز ہے۔ تمام مادی اور انسانی وسائل، انسانیت سوز اسلحہ اور قیامت خیز جوہری توانائی کی تیاری پر صرف ہو رہے ہیں۔ اس برق رفتار تیاری کا مقصد یہ ہے کہ قوت کے بل بوتے پر نسلِ انسانی کی گردن میں ایسا پھندا ڈال دیا جائے جو کسی صورت اتارے نہ اترے۔

سرمایہ دار ملکوں میں مزدور کی حیثیت

اشتراکی جن ملکوں کو سرمایہ داری اور استحصال پسندی کا طعن دیتے ہیں اُن ملکوں میں مزدوروں کو ہر قسم کے حقوق، مراعات اور تحفظات حاصل ہیں۔ اُنھیں اپنے مطالبے منوانے کے لیے ہڑتال کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ لیبر کورٹس اور دوسری عدالتیں اُن کی شکایات رفع کرنے کے لیے قائم ہیں۔ مزدور یونینیں بڑی جاندار اور

موثر ہیں۔ اور انتظامیہ سے اپنے مطالبات منوانے کی قوت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مزدوروں کی اجرتوں میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سرکاری ملازمین کو بونس دینے کا دستور نہیں لیکن مزدوروں کو سال میں تین چار بونس ملتے ہیں۔

سرمایہ دار ملکوں میں مزدوروں کو اتنی اچھی اجرت ملتی ہے کہ پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے پڑھے لکھے افراد وہاں جا کر بطور مزدور کام کرتے ہیں اور جھولیاں بھر کر واپس آتے ہیں۔

اصل بات معیارِ زندگی ہے۔ ان ملکوں میں لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہے۔ وہاں کے عوام خوبصورت مکانوں اور کاروں کے مالک ہیں اور آزادی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوں۔

برطانوی سوشلسٹ آرتھر لیوس لکھتا ہے:

"یہ تسلیم کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں کہ روسی مزدور اپنی محنت سے پیدا شدہ اشیاء میں کچھ زیادہ حصہ پا رہا ہے جو ایک مزدور کسی دوسرے ملک میں حاصل کرتا ہے۔ زیادہ صحیح یہی ہے کہ روس میں اس کا حصہ دوسروں سے کچھ کم ہی ہے۔"

(لیوس آرتھر: اقتصادی جائزہ ۱۹۳۹ - ۱۹۱۹ صفحہ ۱۳۴)

Lewies, to Arthur ; Economic Survey 1919-1939. p. 134.

اے بارمائن لکھتا ہے:

"روس کی اقتصادی زندگی کے مطلق العنانہ اور جابرانہ نظم ونسق سے وہ تمام فوائد زائل ہو گئے ہیں، جن کی توقع ہم کر رہے تھے کہ وہ اجتماعی اقتصادیات کے نتیجہ کے طور پر بیدار ہوں گے ....

.... روس میں مزدوروں کو اپنی محنت کے پھل کا اس سے کہیں کم حصہ ملتا ہے جو کسی سرمایہ دار ملک میں مزدوروں کو ملتا ہے۔ اس سے بھی کم جو زار کی حکومت میں انہیں ملا کرتا تھا۔"

(اے بارمائن: دن ہُو سروائیوڈ صفحہ ۳۱۳)

اشتراکیت اور معاشرتی زندگی

اشتراکیت کسی اصول یا ضابطے کی پابند نہیں۔ وہ مذہب اور متعلقہ اخلاقی اقدار کی مکمل نفی کرتی ہے۔ چنانچہ اشتراکیوں کا ہر قول اور ہر فعل وقتی تقاضوں اور مصلحتوں کے تحت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی معاشرے میں کسی مستقل سماجی قانون و صداقت کا وجود نہیں ملتا اور سارا معاشرہ عدم مرکزیت کے طوفان میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ خاندان، برادری اور قرابت داری کے تمام بندھن ٹوٹ چکے ہیں اور عائلی زندگی کا تقدس پامال ہو چکا ہے۔

انقلاب کے بعد روس میں نکاح کی پابندی ختم کر کے جنسی آزادی کے دروازے کھول دیئے گئے۔ چنانچہ روس میں نفسانی خواہشات کی تسکین اور شراب نوشی پر کوئی پابندی نہیں۔

مسٹر ڈاملیٹ لکھتا ہے:

"وہاں حکومت کے لاوارث بچوں کی پرورش گاہوں کے علاوہ پچاس لاکھ لاوارث بچے مارے مارے پھرتے ہیں۔ جنہیں نہ تو کھانے کو ملتا ہے، نہ رات کو سونے کے لیے چھت میسر آتی ہے، بارہ بارہ برس کی لڑکیوں کی کثیر تعداد ایسی ہے جو روسی نوجوانوں کی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لیے وقف رہتی ہے۔ روسی حکومت اس کو پرائیویٹ تجارت شمار کرتی ہے اور اس کی اجازت دے کر اپنا مقررہ حصہ بطور ٹیکس وصول کرتی ہے۔"

اشتراکی قانون اور نظام حکومت

اشتراکی ملکوں میں انسانی حقوق کا کوئی تصور نہیں۔ قانون، اشتراکیت کے استبدادی نظام کا آلۂ کار بن گیا ہے اور عدالتیں اشتراکی عزائم و مقاصد کی تکمیل کا موثر ذریعہ۔ ایک اشتراکی عدالت کا کام یہ ہے کہ اشتراکیت کے دشمنوں اور مشتبہ افراد کو سخت ترین سزائیں دینے میں تامل نہ کرے

روس میں "طاس" واحد نیوز ایجنسی ہے اور دو اخبار ہیں۔ پروداا شتراکی جماعت کا ترجمان ہے اور ازوستا حکومت کا۔ یہ دونوں اخبار سرکاری گزٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی غیر سرکاری یا غیر جماعتی خبر شائع نہیں ہوتی۔

ہم ریڈیو اور اخبارات میں دنیا بھر کے آزاد ملکوں کی اچھی بری خبریں سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں، لیکن اشتراکی ملکوں کی کوئی خبر سننے یا پڑھنے میں نہیں آتی۔ بس یہی ایک امر اشتراکی ملکوں کی پوری کیفیت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ قید خانوں کی خبریں باہر آ سکتی ہیں لیکن اشتراکی ملکوں کی ہوا تک باہر نہیں آ سکتی۔ اس لیے کہ اشتراکی ممالک ایسے بندی خانے ہیں کہ جہاں سے

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

اشتراکی ملکوں میں کسی جمہوری ادارے یا تنظیم کا وجود نہیں۔ یہاں ایک جماعتی نظام قائم ہے جس کی رکنیت بالکل محدود ہے کیونکہ جماعت کی رکنیت حق و پسند کی بات نہیں، انتخاب و عطا کا معاملہ ہے۔

جماعت انتخاب کے لیے اپنے نمائندے نامزد کرتی ہے جن کے مقابلے میں کوئی اور کھڑا نہیں ہو سکتا، چنانچہ مقابلے کی نوبت نہیں آتی۔ جن کو جماعت نامزد کرتی ہے وہ منتخب قرار پاتے ہیں۔ ان ملکوں میں نامزدگیوں کو انتخابات کا نام دیا جاتا ہے ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا، خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

برطانیہ کے وزیر اعظم اٹلی نے روسی انتخابات کو ایسی گھوڑ دوڑ سے تشبیہ دی تھی جس میں صرف ایک ہی گھوڑا شریک ہو۔

اشتراکیت اور مذہب

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اشتراکیت صرف معاشی فوائد کے حصول کا ذریعہ ہے اور مذہب سے متصادم نہیں، سخت غلطی پر ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد مذہب

دشمنی پر ہے اور اشتراکیت کی انسان دشمنی، اسی مذہب دشمنی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اشتراکیت منافقت اور منافرت کے قالب میں ڈھل کر اُبھری ہے۔ چنانچہ اشتراکی محل وقوع کے مطابق اس کی تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ مغربی ممالک میں جہاں مذہب کو ایک نجی معاملہ خیال کیا جاتا ہے اشتراکیت کی تعبیر اس تعبیر سے مختلف ہوتی ہے، جو اسلامی ملکوں میں پیش کی جاتی ہے۔

اشتراکی، اسلامی ملکوں میں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اشتراکی ہوتے ہوئے بھی مذہب سے تعلق قائم رہتا ہے اور یہ کہ اسلام اشتراکیت کی تائید کرتا ہے۔ لوگ عدم واقفیت کی وجہ سے ان کی باتوں میں آجاتے ہیں حالانکہ اشتراکی لیڈر بڑی بیباکی اور گستاخی کے ساتھ مذہب کا انکار کرتے ہیں۔

مارکس کہتا ہے:

"مذہب لوگوں کے لیے افیون ہے۔"

لینن کہتا ہے:

"نفسِ مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لیے ضروری ہے تاکہ دنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے۔"

لینن مذہب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"مارکسیت، مادیت کا دوسرا نام ہے۔ اس لحاظ سے مذہب کا سخت ترین دشمن ہے۔...... مارکسیت کی الف بے یہ ہے کہ انسان کو مذہب سے لڑنا چاہیئے۔ مارکسیت معمولی مادیت نہیں ہے کہ الف بے پر اکتفا کرکے بیٹھ جائے، یہ اُس سے آگے قدم بڑھاتی ہے اور کہتی ہے کہ انسانیت کو صرف مذہب سے لڑنا ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو لڑائی کے قابل بنانا ہے۔ خدا کے تصوّر کو انسانی ذہن سے محو کرنا اشتراکیت کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔"

Lenin on Religion p. 121.

("لینن آن ریلیجن" صفحہ ۱۲۱)

اسلامی سوشلزم

سوشلسٹ منصوبہ بندی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ بین الاقوامی سطح پر ان کے پروپیگنڈے کی تکنیک ہر ملک کے اقتصادی، سماجی اور اعتقادی احوال ومناظر میں وضع کی جاتی ہے اور حالات کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ سوشلسٹوں کی منصوبہ بندی جزئیات تک محیط ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ پورے ملک کے لیے ایک ہی طرح کی تکنیک پر عمل نہیں کرتے بلکہ مختلف طبقوں کے لیے مختلف تکنیک اور تعبیر ایجاد کرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت طبقہ کی ذہنی سطح اور مخصوص فکری میلانات ملحوظ رکھتے ہیں۔ "اسلامی سوشلزم" کے دوغلے لفظ کی اختراع بھی سوشلسٹوں کی منصوبہ بندی کا کارنامہ ہے۔ سوشلسٹ حسبِ حال الفاظ، اصطلاحات اور سلوگنز ایجاد کرنے میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں اور ان کو بڑی مہارت سے کام میں لاتے ہیں۔ جس طرح سوشلسٹوں نے عیسائی ملکوں میں "کرسچین سوشلزم" کی اصطلاح رائج کی تھی اسی طرح اسلامی ملکوں میں "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

سوشلسٹوں کو ریاکاری کا الزام دینا ایک زائد سی بات ہے کیونکہ وہ ضابطہ اخلاق کے نام سے ناآشنا ہیں، ان کے نزدیک درست بات وہ ہے جو اُن کی پالیسی سے ہم آہنگ ہے اور نادرست امر وہ ہے جو اُن کی پالیسی سے کامل مطابقت نہ رکھتا ہو۔ انسانی اقدار حق پرستی کے سرچشمہ سے پھوٹتی ہیں جب یہ ویران ہو جاتا ہے تو اخلاق وانسانیت کی کھیتی خشک ہو جاتی ہے اور وہاں خونخوار درندے بسیرا کر لیتے ہیں۔

حیرت تو اُن مسلمانوں پر ہے جو زہر اور شربت کے آمیزے کو خالص شربت سمجھ کر پی جاتے ہیں۔ کسی چیز میں زہر کی معمولی مقدار بھی ساری چیز کو مہلک بنا دیتی ہے۔ حقیقی افسوس تو اُن علمائے دین بازر پر ہے جو قبائے امامت زیب تن کیے بڑی ڈھٹائی سے "اسلامی سوشلزم" کا پرچار کرتے ہیں۔

خدا کے اس فرمان کے بعد کہ:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ
نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔

(پارہ ٦ سورۃ ۴ آیت ۲)

ترجمہ: (آج کے دن ہم نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمتیں
تم پر تمام کر دی ہیں، اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند
کیا ہے)۔

اس ارشادِ خداوندی کی موجودگی میں مسلمانوں کے لیے اس حقیقت پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے مبارک زمانے میں اسلامی تعلیمات پر عمل ہوا اور دنیا پر ثابت ہو گیا کہ اسلام دینِ حیات ہے۔ اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے امن و سلامتی کا واحد اور آخری ذریعہ ہے۔ اسلام افراط و تفریط کی قلابازیوں سے مبرّا ہے۔ یہ ایک ایسا فطری ضابطہ حیات ہے جو ہر زمانے اور ہر عہد کے لیے انسانی فلاح و نجاح کا ضامن ہے۔ اس میں انسان کی مادی اور روحانی زندگی کی تہذیب و تربیت اور ارتقاء و ترفع کے جمیع لوازم موجود ہیں۔ آج کی تیرہ و تاریک فضا میں اگر اجالا ہو سکتا ہے تو اسی آفتابِ حیات کی ضیا باریوں سے اور مضطرب انسانیت کو سکون مل سکتا ہے تو اسی کے دامانِ رحمت میں سے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

انسان کا لایا ہوا انتظام مخصوص حالات کی پیداوار ہوتا ہے اور اس پر نظام ساز کے میلانات کی مُہر ثبت ہوتی ہے چنانچہ مرض دُور کرنے کے لیے جو نسخہ تجویز کیا جاتا ہے وہ آگے چل کر ایک دوسرے مرض کی تولید کا باعث بنتا ہے۔

اسلام میں کسی ازم کا جوڑ ایسے ہی ہے جیسے زربفت میں ٹاٹ کا پیوند۔ یہ پیوندکاری اسلام کی حقیت اور جامعیت پر عیارانہ حملہ ہے۔

اقبال اور سوشلزم

نبی کی تعلیم الہام و وحی کا نتیجہ ہونے کے باعث ارتقا و ترمیم کے عمل سے نہیں گزرتی۔ وہ اوّل و آخر ایک ہی رہتی ہے۔ اس کے برعکس شاعر و مفکر کے تصوّرات فکر و مطالعہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ منازلِ ارتقا سے گزرتے ہیں۔

اقبال بھی مفکر تھا وہ بتدریج مقامیت اور بین الاقوامیت کی منزلوں سے گزرتا ہؤا اسلامیت کی منزل تک پہنچتا ہے اور اسلام کو وحدتِ انسانیت کا واحد ذریعہ خیال کرنے لگتا ہے۔

اقبال دراصل قوت و شوکت کا شاعر ہے، وہ ہر فرسودہ اور زوال پذیر اور استحصال پسند نظام کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ سرمایہ داری کے خلاف تھا۔ اُس کی بعض نظمیں اسی احساس و جذبہ کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اُس کو سوشلسٹ خیال کرنے لگے۔ اقبال نے واشگاف الفاظ میں اس کی تردید کی ہے۔ "گفتارِ اقبال" میں اس کی تفصیل یوں ہے:

اسلام اور بالشوزم

"کامریڈ غلام حسین ۱۹۲۷ء میں بالشویک سازش کے مقدمہ میں گرفتار ہوئے۔ غلام حسین جو پہلے ایڈورڈ کالج پشاور میں پروفیسر تھے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر اخبار "انقلاب" جو تمبر ۱۹۲۲ء میں اشتراکی خیالات کی تبلیغ کے لیے نکالا گیا تھا سے منسلک ہو گئے یہ پرچہ مالی خسارے اور محدود دائرۂ مقبولیت کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔ تھوڑے دنوں بعد کامریڈ غلام حسین اور چند دیگر آدمیوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

شمس الدین حسن مدیر "انقلاب" نے اپنے ایک مضمون مورخہ ۲۳۔ جون میں لکھا کہ اگر بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے

ملک کا سب سے بڑا شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کیوں قانون کی زد سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفۂ حیات کا لب لباب ہے اور کارل مارکس کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا آدمی بھی سر محمد اقبال کی "خضرِ راہ" اور "پیامِ مشرق" کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں"۔

(زمیندار ۲۲ جون ۱۹۲۲ء)

جب اقبال کو اس مضمون کا علم ہوا تو اس نے درج ذیل مکتوب اس بارے میں بغرضِ اشاعت "زمیندار" کو ۲۴ جون کو بھیجا۔

مکرم بندہ جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار!

السلام علیکم!

میں نے ابھی ایک دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف سے بالشویک خیالات منسوب کیے گئے ہیں۔ چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے۔ اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔

"میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریقہ یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانونِ میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز

کیا ہے، اور فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی
ہے۔ روس بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض
سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل ہے۔ لیکن حقیقت
یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و
تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو
بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارۃً ذکر کیا ہے۔ شریعتِ
حقّہ اسلامیہ کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری
جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے
کی رُو سے وہی راہ آسان اور قابلِ عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ
السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ
فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے
لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی
اپنی مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے
اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ اُن کو معلوم ہوتا کہ اس خاص
اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے "فاصبحتم بنعمتہ
اخوانا" میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح
معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے
ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول
کے بغیر ایک سوشل نظام کے ممکن نہیں، جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب
حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو اور مجھے
یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے
معلوم کر کے کسی ایک نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ جس
کے اصولِ اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا اُن سے ملتے جلتے ہوں گے
موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ
ہو ان کے طریق عمل سے کس[illegible] کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور

دیگر ملک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظرِ غائر ڈالیں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد سے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیمات کے منافی ہو۔"

(محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا - لاہور)

(گفتارِ اقبال، مرتبہ محمد رفیق افضل صفحہ ۸ - ۵)

باب ۱۱

مذاہبِ عالم پر ایک نظر

زرتشتیت

شہنشاہ جمشید کے عہد میں ایران کی اخلاقی، سیاسی اور سماجی زندگی نہایت ابتر ہو چکی تھی، بادشاہ اپنے آپ کو الوہی صفات کا حامل بتاتا تھا اور عوام اس کی خدائی تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے زرتشتیت نے ظہور کیا۔

زرتشتیت کا مذہبی لٹریچر

زرتشتیت کی کتاب ژند اوستا کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ژند اور اُس کی تفاسیر کا دو تہائی حصہ سکندر اعظم کے حملے کے وقت ضائع ہو گیا تھا، اس طرح کل زرتشتی لٹریچر کا ایک تہائی حصہ بچ سکا، جو محفوظ ہے۔ ایرانی روایت کے مطابق ژند کے مختلف حصے سکندر اعظم کے حملے کے وقت اِدھر اُدھر بکھر گئے جن کو ساسانی بادشاہوں نے از سرِ نو مرتب کرایا تھا۔ ژند کے جو چار حصے بچ رہے ہیں وہ حسبِ ذیل مضامین پر مشتمل ہیں:

(۱) گاتھا (مذہبی گیت)

(۲) دسپریہ (تفسیر)

(۳) دینڈیہ (شریعت)

(۴) یشت (فرشتوں کی مدح کے گیت)

ژند کی زبان ویدوں کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔
زرتشتیت معلم الاخلاق تھا اور اُس نے ایک راہنما کی حیثیت سے لوگوں کے ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کی۔ اُس کے خیالات کو ایران میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ کیانی خاندان کا مشہور بادشاہ گشتاسپ اُس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا۔ اور زرتشتی مذہب ایران کے طول و عرض میں پھیل گیا۔

زرتشت کا تصورِ الوہیت

زرتشت کا تصورِ الوہیت الجھا ہوا ہے، وہ توحید و تثلیث کو بُری طرح گڈمڈ کرتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اھورامزدا (یزدان) کو خداؤں کا خدا، نیکی و دانائی کا سرچشمہ، خالقِ کُل، قادرِ مطلق اور ازلی و ابدی ہستی خیال کرتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ اھرمن (ظلمت) کو اس کا حریف و مدّمقابل قرار دیتا ہے۔ زرتشت کا مرکزی تصور یہ ہے کہ نیکی و بدی (روشنی و ظلمت) ایک ہی ہستی اعلیٰ کے دو مظہر ہیں، جن میں جنگ جاری رہے گی اور بالآخر اھورمزدا (یزداں)، بدی کی روح اھرمن (ظلمت) پر غالب آئے گا۔ اور وہ دن قیامت کا ہوگا۔ دراصل زرتشت اس روائتی تصور سے کہ کائنات اور اس کی حرکت و حرارت خیر و شر کی کشمکش کا نتیجہ ہے، اپنا دامن نہیں چھڑا سکا۔ چنانچہ اُس نے الوہیت کی قوت دو متقابل خداؤں میں تقسیم کر دی۔

زرتشت عقیدہ کے مطابق انسان صاحبِ عقل و ارادہ ہستی ہے اور وہ اپنے اعمال کے لیے جواب دِہ ہے۔ وہ حیات بعد ممات پر یقین رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ نیک اعمال کی جزا ابدی مسرت ہے اور بد اعمال کی سزا ابدی غم۔ نیک لوگ جنّت میں جائیں گے اور بد جہنم میں۔

زرتشت کے نزدیک امن پسند کسان کی زندگی نیک ترین زندگی ہے اور زراعت کا پیشہ شریف ترین پیشہ ہے۔

ہندومت

ویدوں کی تاریخی حیثیت

ہندوؤں کی مذہبی کتاب وید ہیں۔ ابتدا میں یہ تین تھے، بعد میں چار ہو گئے۔ اس بات کا علم نہیں کہ یہ وید کس کی تصنیف ہیں یا کس پر نازل ہوئے۔ ویدک منتروں کی ابتدا میں کچھ نام ملتے ہیں لیکن مفکرین کے مطابق یہ نام اُن لوگوں کے نہیں جن پر یہ نازل ہوئے۔ بلکہ اُن لوگوں کے ہیں جنہوں نے ان کو مرتب کیا۔ خود ہندو مورخین ویدوں کی الہامی اور تاریخی حیثیت کے منکر ہیں۔ ڈاکٹر تارا پد چوہدری لکھتا ہے:

"ان کے علاوہ ویدوں میں واضح طور پر ایسے الفاظ ملتے ہیں جو عام متن سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ متن میں غیر شعوری طور پر غلطی سے اُن لوگوں کے ہاتھ تحریف عمل میں آئی ہے جنہوں نے لکھوایا یا نقل کی۔"

(ڈاکٹر تارا پد چوہدری! دی گنگا جنوری ۱۹۲۲ء صفحہ ۴۷)

پنڈت ویدک لکھتا ہے:

"درحقیقت جو انتشار اتھر وید میں پایا جاتا ہے اُس کی مثال دوسرے ویدوں میں نہیں ملتی۔ سایانہ چاریہ (Sayanacharia) کے بعد بھی بہت سے سکتاس (Suktas) مزید بڑھائے گئے ہیں۔"

(پنڈت ویدک مُنی: وید اسرواسوا صفحہ ۹۷)

Panait Vedic Muni ; Veda Sarvasria P. 97

پنڈت شانتی دیو شاستری لکھتا ہے:

"اول تو یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ وید تین ہیں یا چار۔ منو
منوسمرتی اور شتاپتھا (shatapatha) کے مطابق رِگ وید یجر وید
سام وید صرف وید ہیں اور یہ تعداد میں تین ہیں، لیکن وجے اپنشد
برہمنا اپنشد اور منڈکا اپنشد کے مطابق وید چار ہیں۔"
(پنڈت شانتی دیو شاستری: دی گنگا فروری صفحہ ۲۲۱)

Pandit Shanti Dev. Shanti. The Ganges

Feb. 1931. p.231.

ہندومت کا تصوّرِ الوہیّت

ہندومت میں کائنات کے کل مظاہر اور قوتوں کو خدائی کا مقام حاصل ہے، چنانچہ برہما (پیدا کرنے والا خدا) وشنو (پرورش کرنے والا خدا) اگنی (آگ) والا خدا) اگنی (آگ)، اندر (بارش اور رعد) وریو (ہوا)، ورونا (آسمان) سے لے کر دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں، حیوانوں، سانپوں سب کی پرستش کی جاتی ہے۔ متعدد اوتاروں، دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیاں ان پر مستزاد ہیں۔ ان دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کے حضور نذرانے پیش کیے جاتے ہیں اور حیوانوں اور انسانوں کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔

ہندوؤں کی معاشرتی زندگی

ہندوؤں کی اصنام پرستی نے ہندو سماج کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ خاص طور پر عورت بے چاری کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ بیان کرتے شرم ہوتی ہے۔ نیوگ (اولاد کی خاطر غیر مرد کے پاس جانا)، ستی (مُردہ خاوند کے ساتھ زندہ چتا میں جل مرنا)، عقدِ ثانی کی ممانعت ایسی رسمیں ہیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہندوؤں کی پوری کی پوری سماجی زندگی گوناں گوں خرافات سے بھرپور تھی۔ ہر موقعہ اور ہر واقعہ کے لیے رسمیں مقرر تھیں جن کی بجا آوری کے لیے پروہتوں

کی جماعت موجود رہتی ہے۔

اپنشدوں کا فلسفۂ الٰہی

اپنشدوں میں ہندوؤں کا فلسفۂ الٰہی پوری طرح نمایاں ہوتا ہے اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اپنشد مسئلہ وحدت الوجود کا سب سے قدیم سرچشمہ ہے۔ مسئلہ وحدت الوجود ایک طرف تو ہر وجود کو خدا قرار دیتا ہے، دوسری طرف خدا کے لیے کوئی متعین تخیل بھی پیش نہیں کرتا۔ چنانچہ اس تصور کو عوام نے بت پرستی اور خواص کو وحدت الوجود کا طریقہ عطا کیا۔

ہندوؤں کی قنوطیت پرستی

ہیگل کے خیال کے مطابق ہندوستان کی رُوح ایک خواب دیکھنے والے لڑکے کی روح تھی، ہندوستان کا تصور دھندلا، ہمہ اوست کے عقیدے کا حامل اور تجریدی تھا۔ ہندو کی زندگی جامد اور بے کیف تھی، وہ جسمانی، سیاسی اور سماجی اعتبار سے غیر پسندیدہ تھی۔ ہندو عارفین دنیا کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے زندگی کی بے حقیقتی پہ غور کرتے اور زندگی سے جلد نجات حاصل کرنے کے متمنی رہتے تھے۔ ہندوؤں کی اس ہمہ گیری اور گہری قنوطیت کے تین اسباب ہیں: مسئلہ کرم، فلسفیانہ سوچ اور ذات پات کی تقسیم۔

مسئلہ کرم

ہندوؤں کی قنوطیت کا اہم ترین سبب مسئلہ کرم ہے، جس کی ترجمہ بالعموم آواگون یا تناسخ کیا جاتا ہے اور جو اپنشدھ میں مذکور ہے۔ آواگون کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی روح حقیقی اور مستقل وجود رکھتی ہے اور بار بار جون بدلتی ہے۔ جب یہ روح دوسری جون میں جاتی ہے تو پہلی جون میں کیے ہوئے اعمال کے نتائج بھی ساتھ لے جاتی ہے اور یہ کسی جون میں پیچھا نہیں چھوڑتے۔ پہلی جون میں کیے ہوئے گناہوں کی سزا مسلسل ملتی رہتی ہے اور یہ سزا آدمی کو ان جرموں کی ملتی ہے جس کا اُس کو نئی جون میں کوئی علم

نہیں یا کم از کم موجودہ حالات میں اس کو ان کا جواب دِہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

ظاہر ہے ایسا نظریہ اخلاقی جرأت و آزادی، جذبۂ فکر و عمل اور احساس ذمہ داری کو کچل دیتا ہے اور آدمی موجودہ زندگی کو گزشتہ زندگی کا کفارہ سمجھ کر خاموش و بے عمل بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اپنے مصائب کا ذمہ دار کسی ظالم فرد یا خود غرض معاشرے کو نہیں ٹھہراتا بلکہ ناقابلِ فہم تقدیر کو۔

ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادہ پرستوں کا قانون علیت اور ہندوؤں کا مسئلہ کرم دونوں اساسی طور پر ایک ہیں اور ایک ایسے نتائج پیدا کرتے ہیں۔

"پہلی جون" کا متبادل "گزشتہ علت" ہے اور "نئی جون" کا متبادل "معلول" ہے۔ دونوں نظریات انسانی اختیار اور ارادے کی نفی کرتے ہیں۔ نتائج کے اعتبار سے بھی دونوں یکساں ہیں۔ احساس ذمہ داری اور مسئولیت سے دونوں یکساں طور پر آزاد ہیں اور دونوں میں نامعلوم اعمال کی جزا یا سزا ملتی ہے۔

فلسفیانہ بلند پروازی

دوسرا اہم سبب ہندو ذہن کی فلسفیانہ بلند پروازی ہے۔ ہندو عارفین کی تمام تر سوچ تجریدی تھی اور انہیں تجربے اور مشاہدے کی ساری دنیا سے کوئی سروکار نہیں تھا، وہ وحدت الوجود کے قائل تھے اور فطرت کو مایا (فریب، تخیل) کہا کرتے تھے۔ اُن کا نظریہ تھا کہ فطرت حقیقت کے چہرے پر پردہ ہے اس لیے گیان دھیان کے وقت سے روگشی لازمی ہے۔ یہ اس تصور کا اثر تھا کہ ہندوستان کے بہترین دماغ زندگی سے فرار اختیار کرتے رہے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ زندگی کی آلائشوں سے نجات مل جائے، بلکہ اس لیے کہ خود زندگی سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

ذات پات کی تقسیم

تیسرا سبب ذات پات کی تقسیم ہے۔ برہمنوں کے زیر اثر جو ہندو معاشرہ تعمیر ہوا

اس کے معاشرتی قوانین منو کے دھرم شاستر میں درج ہیں۔ دھرم شاستر کی رُو سے ہندو سماج کے چار طبقے برہمن، کھشتری، ویش اور شودر مقرر کیے گئے ہیں۔ برہمنوں کا کام علم و فکر کی زندگی بسر کرنا اور مذہبی رسوم بجا لانا ہے۔ کھشتری حکمرانی اور سپہ گری کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ویش اہل صنعت و حرفت و تجارت ہیں اور شودر سب طبقوں کے غلام ہیں۔ برہمنوں کو دوسرے طبقوں کے مقابلے میں خاص مراعات و امتیازات حاصل تھیں، وہ معاشرے کا دماغ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ سب پر فائق ہیں۔

برہمن کا بچہ برہمن، کھشتری کا بچہ کھشتری، ویش کا بچہ ویش اور شودر کا بچہ لازمی طور پر شودر رہتا ہے۔ ان چار طبقوں کا کوئی فرد اپنی برادری نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ تقسیم پیدائشی، ابدی اور غیر متبدل ہے۔ اس تقسیم پر کسی فرد یا طبقہ کو شکایت و احتجاج کا حق حاصل نہیں۔ کیونکہ مسئلہ کرما کے مطابق یہ تقسیم پچھلے جنم میں کیے ہوئے کرموں کا پھل ہے۔

ہندومت کے تمام نظریات نفرت پر مبنی ہیں جو ہمہ گیر ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں کو مختلف ذاتوں میں تقسیم کر کے نفرت کا زہر پھیلا دیتا ہے اور نہ ماننے والوں کو اچھوت قرار دے کر پوری انسانیت کی تذلیل کرتا ہے۔ اچھوت کا مطلب یہ ہے کہ غیر ہندوؤں سے کسی قسم کا سماجی تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ اُن سے رشتے ناطے تو ایک طرف، اُن کے ساتھ کھانا کھانا، اُن کے برتنوں میں پانی پینا اور اُن کے ساتھ مل بیٹھنا سب پاپ ہے۔ حتیٰ کہ اُن کے ذرا چھو جانے سے یہ اپنے آپ کو برشٹ (ناپاک) خیال کرتے ہیں۔

ہارکورٹ ایک ہندوستانی کا خط نقل کرتا ہے جو اُس نے ایک انگریز دوست کو ہندومت کے متعلق تحریر کیا:

> "تم چاہتے ہو کہ میں ہندومت کی تعریف کروں، مجھے افسوس ہے کہ میں تم کو مایوس کروں گا۔ ہندومت نہ تو ایک مذہب ہے، نہ ہی ایک مسلک اور نہ ہی ایک عقیدہ ہے۔ یہ اُن تمام مذہبوں، مسلکوں اور عقیدوں کا معجون مرکب ہے، جو اس ملک میں اب تک نمودار ہوئے ہیں۔

مزید برآں ہندومت اُن تمام منازل پر محیط ہے، جن سے مذہبی جذبہ یا فلسفیانہ خیال ترقی کرتا ہوا گزرا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ہندومت دوسرے مذہبوں کی طرح نہیں، بلکہ اس میں تمام مذاہب، نیم مذاہب اور ہندو نسل یا نسلوں کے رسم و رواج شامل ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی خیال نہ کیجئے کہ میں مبالغہ سے کام لے رہا ہوں ہندو مت کے نام پر شرک، توحید، وحدت الوجود اور کفر سب پھیلے ہوئے ہیں۔ . . . . اس کے جال میں بھوتوں کی پرستش، اجداد کی پرستش، ذی حیات اور غیر ذی حیات کی پرستش، نیچر کی قوتوں کی پرستش اور خدا کی پرستش بُن دیئے گئے ہیں۔ . . . . . . اس میں پرستش کی پاک ترین صورت سے لے کر ناپاک ترین صورت تک اور فلسفیانہ خیال کی اعلیٰ ترین پرواز سے لے کر ذہن و مذہب کی ناشائستہ ترین صورت تک تمام مدارج موجود ہیں۔"

ایچ ہارکوٹ: سائیڈ لائٹس آن دی کرائیسس اِن انڈیا، صفحہ ۲۹-۲۸

H. Harcourt : Sidelights on the crisis in India p.p. 28-29

بُدھ مت

ہندوستان میں برہمنوں کا دَور دَورہ تھا، دولت و قوت اُن کے ہاتھ میں تھی، عوام اُن کے بنائے ہوئے نظامِ معاشرت کی وجہ سے جاں بلب تھے۔ پانچ سو قبل مسیح بدھ ریفارمر کی حیثیت سے ہندوستان کے مذہبی اسٹیج پر نمودار ہوا۔

بدھ کا پہلا وار برہمنی رواج پر تھا۔ جس نے انسان کو چار طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اُس نے شودروں کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر کے ذات پات کی تقسیم کو غلط ثابت کیا۔ اُس نے اعلان کیا کہ مذہبی رسوم کی بجا آوری کے لیے کسی پنڈت یا پروہت کی ضرورت نہیں، ہر شخص آپ اپنا پنڈت ہے اُس نے اشنام پرستی

کو باطل قرار دیا اور کہا کہ دیوتاؤں اور دیویوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔

بدھ کا فلسفہ سراسر سلبی ہے

بدھ کے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی نوعیت فلسفیانہ تھی۔ انتہائی تفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دوبارہ جنم کا سبب خواہش کی موجودگی ہے۔ زندگی اور غم ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، بالفاظِ دیگر زندگی ایک برائی ہے، جس سے نجات ضروری ہے۔ بدھ کے نظریہ کے مطابق انسانی جسم عناصر کا مرکب ہے۔ جب یہ عناصر تحلیل ہو جاتے ہیں تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ اگر خواہش کا وجود باقی نہ رہے تو دوبارہ جنم عمل میں نہیں آتا۔ دراصل خواہش کی موجودگی ہی منتشر شدہ عناصر کو دوبارہ اکٹھا کر کے زندگی کے نئے مرکبات کے ظہور کا باعث بنتی ہے۔ پس اگر خواہش سے نجات حاصل کر لی جائے تو ان عناصر کو زندگی کے نئے مرکب میں ڈھالنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ بدھ کے تصورات کے مطابق جب انسان زندگی کی ہر چیز سے قطع تعلق کر لیتا ہے اور دل کو ہر طرح کی آرزو سے پاک کر لیتا ہے تو اسے نروان نصیب ہوتا ہے۔ نروان سے مراد وجود کی نیستی نہیں بلکہ کامل ذہنی سکون کی وہ کیفیت ہے جو ہر قسم کے لگاؤ اور آرزو سے نجات حاصل کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

بدھ کا نظریہ حیات

بدھ کے خیال کے مطابق زندگی سراسر عذاب ہے، جس میں رنج و غم کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ اس کے نزدیک افضل ترین نیکی ترکِ دنیا اور بہترین زندگی رُہبانیت کی زندگی ہے۔ ترکِ دنیا اور رہبانیت ہستی کی انانیت اور انفرادیت ختم کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اچھا بدھی وہ ہے جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے، اپنے ہاتھوں سے ان میں پیوند لگائے، جنگلوں میں بسیرا کرے، وہاں بھی کوئی جھونپڑا نہ بنائے، سونے سے اجتناب کرے، جب نیند بہت ستائے تو کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھ جھپکا لے۔ بیشتر وقت فاقہ کرے۔ جو ملا

نہ جلائے۔ بھوک بہت ستائے تو بھیک مانگ کر گزارہ کرلے۔

بدھ جس زندگی کا نقشہ پیش کرتا ہے وہ زندگی معاشرتی تعلقات، کھیل کود، تفریحات، لذات، شہوات اور ہر طرح کی برائیوں سے مکمل رُوکشی اور پرہیز کی زندگی ہے۔ بدھ عورت کے قرب کو بھی خطرناک سمجھتا ہے۔ انندھا نے جب بدھ سے پوچھا کہ "عورتوں کے معاملہ میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیئے" تو بدھ نے جواب دیا:

"انندھا اُنہیں مت دیکھو۔"

انندھا نے کہا کہ:

"اگر ہم اُنہیں دیکھ لیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

بدھ نے جواب دیا:

"ایسی صورت میں چوکس اور خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔"

بدھ روح اور خدا کے وجود کے متعلق خاموش ہے۔ وہ صرف پراکرتی یعنی مادۂ ازلی کا ذکر کرتا ہے؛ وہ کہتا ہے:

"زندگی عناصر کے مرکب کا نام ہے۔ جب یہ تحلیل یا منتشر ہوتے ہیں تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ خواہش ایک پُراسرار کشش ہے اسی کی بدولت ایٹموں میں دوبارہ جذب پیدا رہتا ہے اور زندگی کے نئے مرکبات ظہور میں آتے ہیں۔"

یہودیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، حضرت اسحٰق اور حضرت اسمٰعیل۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرتِ اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی نام ہے، جس کے معنی خدا کا بھیجا ہوا، خدا کا بندہ ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے گیارہ بیٹے تھے، جن میں سے حضرت یوسف علیہ السلام اور یہودا

خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہودائی نسل یہودی کہلانے لگی ۔

اسرائیلی ادب

سید سلیمان ندوی اسرائیلی ادب کے متعلق لکھتے ہیں :

"ادبیاتِ اسرائیلیہ کا مجموعہ تورات، کبتیم، نبیم، ترگوم، مدراس، اور تالمود سے عبارت ہے۔ تورات ایک عبری لفظ ہے جس کے معنی شریعت اور قانون کے ہیں۔ اس نام کا اطلاق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچوں کتابوں پر ہوتا ہے یعنی سفرِ تکوین (در ذکرِ بدءِ کائنات، آدم و حوا، نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، یعقوب، یوسف) سفرِ خروج (در ذکر موسیٰ، فرعون، بنی اسرائیل، یعقوب، یوسف) سفر الاحبار (شریعت و قانون، حلال و حرام) سفر العدد (در ذکر تعداد بنی اسرائیل، وقتِ خروج از مصر، غزواتِ موسیٰ و بعض احکام شریعت) سفر الاستثناء (در ذکر قوانین و احکام شریعت)

نبیم کی جمع بقاعدہ عبری "ی" اور "م" کے ساتھ ہے۔ عربی قاعدہ سے نبیین کہنا چاہیے۔ نبیم انبیائے بنی اسرائیل کے کلام و مواعظ و مراثی کا مجموعہ ہے۔ جن میں بہت سی تاریخی باتیں بھی ضمناً مذکور ہیں ......
اکثر تورات کا اطلاق تورات اور نبیم دونوں پر ہوتا ہے اور ان میں سے بعض کو کبتیم بھی کہتے ہیں .... ترگوم یا ترجوم یعنی ترجمہ و بیان۔ ترگوم آرامی زبان میں تورات و نبیم کی بنیر توضیح کا نام ہے جو ربیوں (ائمہ یہود) نے انبیاء کی زبانی یادداشت و روایات کی بنا پر کی۔ اس کی تصنیف کا زمانہ قبل مسیح سے ۱۰۰ء تک ہے۔
مدراس کا درجہ ہمارے ہاں کی احادیث کا ہے۔ لفظ "مدراس" اور عربی "درس" ایک چیز ہے۔
تالمود یا تلمود فقہ اسرائیلی ہے، جس کی بنیاد کتبِ سابقہ پر ہے ....
یہود کے ہاں یہ تمام کتابیں مستند ہیں، نصاریٰ صرف تورات، کبتیم، اور

نبیم کو تسلیم کرتے ہیں اور انہی کے مجموعہ کو وہ "عہد نامہ عتیق" کہتے ہیں ......"

(سید سلیمان ندوی: ارض القرآن، صفحہ ۲۵ - ۲۴)

یہودیت اور قوم پرستی

عہد نامہ عتیق پر مشتمل کتابوں میں انسانی عمل و دخل سے بڑی ترمیم و تنسیخ ہو چکی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام توحید کے قائل تھے اور وحدت انسانی کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا:

"میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔"

(سفر خروج)

مرور ایام کے ساتھ یہ ہمہ گیر پیغام قوم پرستی میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ مریم جمیلہ اس المیہ پر یوں رقمطراز ہیں:

"یہودیت کا مذہب قوم پرستی کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہو چکا ہے کہ دونوں کے درمیان بمشکل امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ یہودیت کا لفظ "یہودا" سے ماخوذ ہے جو ایک قبیلے کا نام ہے۔ ایک یہودی، یہودا قبیلے کا فرد ہوتا ہے۔ اس مذہب کے نام سے بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کوئی عالمگیر پیغام اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ کوئی یہودی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نوع انسانی کی رہنمائی کے لیے اس کے نازل کردہ پیغام پر ایمان رکھنے اور اس کی پیروی کو تقاضائے ایمان سمجھنے پر یہودی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس لیے یہودی ہے کہ یہودی ماں باپ کے گھر پیدا ہوا ہے۔ اب چاہے وہ کھلے بندوں ملحد بن جائے، اپنے یہودی بھائیوں کی نظروں میں یہودی ہی رہے گا۔ اس فساد کامل نے

قوم پرستی کے ساتھ مل کر یہودی مذہب کو روحانی طور پر مفلس و قلاش کر دیا ہے۔ خدا پوری نوعِ انسانی کا خدا نہیں بلکہ اسرائیل کا خدا ہے کتابِ مقدس اللہ کی نازل کردہ وحی نہیں ہے جو پوری نوعِ انسان کی طرف بھیجی گئی ہے بلکہ بنیادی طور پر یہودیوں کی تاریخ ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام اللہ تعالےٰ کے برگزیدہ رسول نہ تھے، بلکہ محض یہودی بادشاہ تھے۔ یہودیوں کا انحصار آخرت میں کامیابی پر اتنا نہیں جتنا کہ فلسطین کی واپسی ہے۔۔۔۔۔ اس قوم پرستی کی بنا پر یہودیوں نے حضرت عیسٰی اور حضرت یحییٰ علیہما السلام پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور انہیں بدعتی قرار دے کر ذلیل و رسوا کیا۔ کیونکہ یہ حضرات جو پیغام دے رہے تھے وہ یہودیوں میں عام پھیلے ہوئے قومی جذبے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے رسالت کا منصب لے لیا اور ان کی ایک بڑی قرابت داروں یعنی عربوں کو عطا کر دیا۔"

(جمیلہ مریم: اسلام ایک نظریہ۔ ایک تحریک صفحات ۱۴۲ - ۱۴۴)

عیسائیت

حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں دینِ اسلام اور یہودیت اور عیسائیت کے باہم مختلف ہونے پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"جب اللہ تعالےٰ کسی نبی کو بھیج کر اس کے ذریعہ کسی ملت کو قائم کرتا ہے تو وہ اس کو نہایت واضح طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس میں کسی قسم کی کجی یا ابہام وغیرہ نہیں رہنے دیتا۔ وہ دین اس نبی کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی اس کے حواریین اور مخلص اصحاب کے ذریعے محفوظ رہتا ہے۔ کچھ مدت گزر جانے پر بعض نااہل [illegible] جانشین ہوتے ہیں جن کے تعاون

اور تساہل کی وجہ سے دین مذکور اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رہتا اور حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"جب کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو اس کی امت کے حواریین اور اس کے اصحاب اس کی سنت کو قائم رکھتے ہیں اور اس کی تعلیم کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن اس طبقہ کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کے قول اور عمل میں مطابقت نہیں ہوتی، ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر وہ خود عمل پیرا نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کا ان کو حکم نہیں دیا گیا ہوتا۔"

الغرض دینِ حق میں آمیزش دو صورتوں پر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ:

(الف) وہ لوگ شرک جلی کرنے لگیں اور

(ب) صریحًا اس کے احکام اور تعلیمات بدل دیں، یعنی تحریفِ تصریح اس میں واقع ہو۔

یہ دونوں ایسی صورتیں ہیں جن کو کبھی اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتا۔

دوسری صورت باطل کی یہ ہے کہ شرک خفی اور تحریفِ غیر صریح ہو جس پر اللہ تعالیٰ اس وقت تک مؤاخذہ نہیں فرماتا جب تک کہ اپنا کوئی رسول یا نبی بھیج کر اتمام حجت نہ کرے۔ یعنی وہ رسول اور نبی واضح طور پر ان کے شرک اور ان کی تحریف کی حقیقت انہیں سمجھا دے تاکہ اُن لوگوں کا ہدایت یا ضلالت کا راستہ اختیار کرنا از راہِ بصیرت ہو اور اس کے لیے عذر کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جب رسول مبعوث ہوتا ہے تو وہ اس دینِ محرّف کی ہر ایک بات کو اپنی اصلی حالت پر لے آتا ہے۔ چنانچہ وہ دینِ رائج کے ہر گوشہ پر نظرِ غائر ڈالتا ہے۔ جو باتیں اس کو ایسی نظر آتی ہیں جو درحقیقت شعائر اللہ کی نوعیت کی ہوں اور باطل کی آمیزش سے محفوظ ہوں، یا وہ اس قسم کی عبادات اور ارتفاقات ہوں جن پر ملتِ حقّہ کے اصول منطبق ہوتے ہوں تو وہ اُن کو بحال رہنے دیتا

ہے اور ان کی شان کو اور زیادہ بلند کر دیتا ہے۔ اور اگر ان عبادات اور ارتقاناقات میں کچھ بھی تحریف ہوئی ہے تو وہ اس کے متعلق بتا دیتا ہے کہ یہ دینی تعلیم کا نتیجہ نہیں۔ لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں آمیزش کی ہے۔

انجیل

قرآن پاک کی رُو سے انجیل وہ کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور جس شکل وصورت میں وہ عیسائیوں کے پاس تھی اس کو انجیل ہی کہا گیا ہے۔ گو ان چاروں کتابوں میں سے جن کو عیسائی اناجیل کے نام سے موسوم کرتے ہیں کوئی بھی حضرت عیسےٰ علیہ السلام پر نازل شدہ انجیل نہیں بلکہ وہ چار الگ الگ شخص کی تصانیف ہیں۔ ایک متی کی، ایک لوقا کی، ایک یوحنا کی اور ایک مرقس کی۔ عیسائی ہر چہار اناجیل، بارہ حواریوں، متعدد رسولوں اور یوحنا کے اقوال ونصائح کے مجموعہ کو عہد نامہ جدید کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ عہد نامہ عتیق کی طرح عہد نامہ جدید کی تمام کتب تحریف شدہ ہیں۔ تحریف حرف سے ہے جس کے معنی کنارہ یا حد ہے۔ اور تحریف کے معنی تغیر وتبدل کرنا ہے، تغیر وتبدل لفظی بھی ہو سکتا ہے، اور معنوی بھی۔

تحریف بائیبل

پادری ڈملو جس نے بائیبل کی تفسیر لکھی ہے، تحریف لفظی کا اقرار ان الفاظ میں کرتا ہے:-

" اناجیل کے لکھنے والے یسوع مسیح کے اقوال کو یونانی میں لکھتے ہیں حالانکہ وہ اغلباً اکثر روحی زبان میں گفتگو کرتا تھا، نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کاتبوں کو کبھی یہ خیال تھا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے جائیں گی جن سے وہ خود آشنا تھے۔ یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے، اس کے خطوط جن کی اب اس قدر عزت کی جاتی ہے وہ اصل

میں انہی کلیساؤں میں لکھے گئے تھے جن کے نام وہ تھے، جنہوں نے پہلے ان کو نقل کیا وہ ہرگز ان کو ان معنوں میں پاک تحریریں نہیں سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔"

یہی مفسّر ایک اور مقام پر اس سے بھی واضح الفاظ میں لکھتا ہے:

"پچھلے صفحوں میں ہم مقدس الفاظ کی حفاظت میں اس احتیاط کا خیال نہیں پاتے جو عہدنامہ عتیق کے متعلق پایا جاتا ہے۔ ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض وقت وہ الفاظ درج نہ کرتا تھا جو اصل عبارت میں درج ہوتے تھے بلکہ وہ درج کرا دیتا جو اس کے خیال کے مطابق درج ہونے چاہیئے تھے وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض اوقات اصل عبارت کو بدل کر اس عبارت کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس میں وہ خود ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالہ جات کے علاوہ، قریباً چار ہزار عہدنامہ جدید کے یونانی نسخے موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عبارات میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔"

اناجیل میں تحریف کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، یہاں صرف چند ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

متی باب ۱۷ کی اکیسویں آیت "مگر اس طرح کے بغیر دعا و روزہ کے نہیں نکالے جاتے" ترمیم شدہ ترجموں سے نکال دی گئی ہے۔ اسی انجیل کے انیسویں باب میں جہاں کوئی شخص مسیح کو نیک استاد کہہ کر مخاطب کرتا ہے، اور مسیح جواب میں کہتا ہے:

"مجھے نیک کیوں کہتا ہے؟"

ترمیم شدہ ترجموں میں یہ لفظ ہیں:

"تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے"۔

مختصر یہ کہ تحریف بائبل ایک ایسی صداقت ہے جس کا سب اعتراف کرتے ہیں۔

بائبل میں توحید کا سبق

وسیع تحریف کے باوجود اللہ تعالیٰ نے تمام عیسائیوں پر اتمام حجت اور بقائے صداقت کے لیے ایسے کلمات کو محرّف ہونے سے محفوظ رکھا ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تثلیث کے نہیں توحید کے معلم تھے۔

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر۔"
(متی)

عیسائیت کا المیہ

مریم جمیلہ عیسائیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے:

"یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ شریعت الٰہی کے محافظ ہونے کا دعوے کرتے ہیں یا کم ازکم ان کے ہاں شریعت الٰہی کی اطاعت کا تصور باقی ہے۔ ان سے عظیم ترمہلک غلطی یہ سرزد ہوئی کہ انہوں نے اس شریعت کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیا، یہ نسل پرستی اپنے نقطۂ انتہا کو اُس وقت پہنچی جب بابلونا میں جلاوطنی کے بعد فارس کے کریم النفس بادشاہ سائرس کے زمانہ میں یہودیوں کو اپنے وطن جانے کی اجازت مل گئی اور ان کے راہنما عذرا نے سامریوں کے اُن یہودیوں کو یہودی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو فلسطین میں پیچھے رہ گئے تھے۔ سامریہ کے یہ یہودی تورات پر ایمان صادق رکھتے تھے لیکن عذرا نے اُنہیں صرف اس لیے کافر قرار دے دیا کہ انہوں نے غیر یہودیوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اگرچہ یسوع مسیح علیہ السلام کے پیروکار حقیقت (سزیری) کو پوری نوعِ انسانی پر حاوی سمجھتے تھے۔ لیکن آخر کار اُن کے اندر یہ تصور عام ہو گیا کہ یہودی قوم اور اغیار (gentile) کے درمیان حائل شدہ رکاوٹوں

کو زائل کرنے کے لیے موسوی شریعت کو مسترد کر دینا لازمی ہے۔ چنانچہ انہوں نے پیغام کو فراموش کر دیا اور پیغمبر کی پوجا شروع کر دی۔
یہ فیصلہ کہ مسیحیت اپنے دور کی غالب تہذیب کا رُخ متعین نہیں کرے گی، بلکہ وہ تہذیبِ مسیحیت کو خاص رُخ پر چلائے گی، بڑے دُوررس نتائج کا حامل تھا۔ اس نے مسیحیت میں لاتعداد بدعتوں اور تحریفات کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ نئے نئے عقاید مسیحیت میں داخل ہونے لگے۔ باپ بیٹے اور روح القدس کا ذاتِ باری میں متحد ہونے کا عقیدہ، یہ عقیدہ کہ خدا نوعِ انسانی کو اپنی رحمت و شفقت سے نوازنے کی خاطر اپنے بیٹے یسوع مسیح (علیہ السلام) کی صورت میں ظاہر ہوا، یہ عقیدہ کہ یسوع مسیح نے مصائب جھیل کر اور صلیب پر جان دے کر تمام نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ حضرت آدم اور حوّا کے ابتدائی گناہ پر یہ عقیدہ کہ انسانی فطرت وراثتاً بد ہے، تمام انسان گنہگار پیدا ہوتے ہیں اور یسوع مسیح کے نجات دہندہ ہونے پختہ و کامل ایمان انہیں نجات سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ یہ سب مسیحی عقاید یہودی روایات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ مسلمان علماء کہتے ہیں کہ یہ عقاید کافروں کے اُن مذہبی رسوم اور طور طریقوں سے ماخوذ ہیں، جو رومی سلطنت کے طول و عرض میں عام طور پر مروّج تھے۔
تصویروں اور مجسموں کی حرمت کے بارے میں موسوی فرمان کو یونان کی فنی روایات کے حق میں مسترد کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یسوع مسیح (علیہ السلام) کی الوہیت کے عقیدہ میں اور زیادہ شدت سے غلو پیدا ہو گیا۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مسیحوں کا عہد نامہ جدید یسوع مسیح (علیہ السلام) کی اپنی زبان ارامی میں (جو ایک اور سامی زبان ہے اور عبرانی اور عربی سے گہرا رشتہ رکھتی ہے) کبھی قلم بند نہیں کیا گیا۔ یہ عہد نامہ پہلی مرتبہ یونانی زبان میں مرتب ہوا کیا یہ بات حیران کن نہیں کہ عہد نامہ جدید کے موجودہ تراجم میں یسوع مسیح علیہ السلام کے

تمام تہواروں کے نام یونانی اور لاطینی ہیں۔ گویا وہ اپنے عبرانی ناموں پر نادم و شرمسار تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ساؤل نے اپنا نام بدل کر پال رکھ لیا تھا۔ گویا اس نے اسرائیل کی عبرانی روایات کو مسترد کرنے اور رومی ثقافت کو اپنانے کا واضح مظاہرہ کیا۔ اس طرح عہد نامہ جدید کا ادبی اسلوب عبرانی صحائف کی اثر انگیز سادگی سے عاری ہے۔ اس کے برعکس وہ اس متصوفانہ سوفسطائیت سے مملو ہے جو یونانی فلسفہ کے ساتھ مخصوص ہو چکی ہے۔ مسیحیوں کے دو بڑے تہوار کرسمس اور ایسٹر اصلاً تمام تر کافر (Pagon) تہوار ہیں۔ حتیٰ کہ نام نہاد مسیحی کیلنڈر بھی اپنے کافر ماخذ کا پتہ دیتا ہے۔ یہی نہیں دنوں اور مہینوں کے نام تک یونانی اور رومی دیوی دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ کلیسائی نظام حکومت بھی براہِ راست کافر رومی شہنشاہ ڈائیوکلیشین کی انتظامی اصلاحات کے خطوط پر استوار کیا گیا۔ اور آج تک انہی پر قائم چلا آتا ہے۔ عالمی مسیحیت کی بھاری اکثریت کا مقدس ترین شہر یروشلم نہیں کافر روما ہے۔ رومن کیتھولک چرچ کی اصطلاح سے بڑھ کر بھی کوئی متناقض اصطلاح ہو سکتی ہے؟

پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاحِ کلیسا و تجدید کے بعد مسیحیت کا لادینی نظریہ یہودی روایات کی محدود مقامی قوم پرستی کے ساتھ مل جُل گیا اور اس سنجوگ کے نتیجے میں جدید مغربی تہذیب پیدا ہوئی۔"

(مریم جمیلہ: اسلام ایک نظریہ، ایک تحریک، صفحات ۲۲-۳۱)

تمام انبیاء و رسل کی اصل تعلیم فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ سب اللہ کے پیامبر اور صداقت کے علمبردار ہیں۔ تحریف تو انسانی کج فہمی اور کج اندیشی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کی رُو سے تفریق بین الرسل ناجائز ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم

دراصل حضرت عیسٰے علیہ السلام معلّم الاخلاق تھے، وہ نخوت و تکبّر سے نفرت کرتے تھے اور عجز و انکساری کی تبلیغ کرتے تھے، وہ سراسر عفو و رحمت تھے اور تعذیب و عقوبت کے مقابلے میں محبت و شفقت اور پند و نصائح سے اصلاح کرنے کے

قائل تھے۔ فرماتے ہیں:

"مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت اُنہی کی ہے، مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہ تسلی پائیں گے۔ مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ وہ زمین کے وارث ہیں۔ مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے بھوکے پیاسے ہیں کیونکہ وہ آسودہ ہوں گے مبارک ہیں وہ جو رحم دل ہیں، کیوں کہ اُن پر رحم کیا جائے گا۔"

(متی)

"تو کیوں اپنے بھائی کے آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر غور نہیں کرتا؟ اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ لا تیری آنکھ سے تنکا نکال دوں؟ اے ریاکار! پہلے اپنی آنکھ سے شہتیر نکال۔ پھر اپنے بھائی کی آنکھ میں سے تنکے کو اچھی طرح نکال سکے گا۔" (متی)

"تھوڑے عرصے کے بعد یوں ہوا کہ وہ منادی کرتا اور خدا کی بادشاہی کی خوشخبری سناتا ہوا شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرنے لگا اور وہ بارہ اُس کے ساتھ تھے۔" (لوقا)

قرآن مجید

قرآن آخری اور عرفانی کتاب ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی راہنمائی کے لیے روزِ اوّل سے وحی کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے، حضرت موسےٰ علیہ السلام کی تورات، حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی انجیل سب الہامی کتابیں ہیں۔ سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن نازل فرمایا گیا۔ جو الوہی ہدایت کی آخری اور مکمل ترین کتاب ہے۔

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ۔ (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۷ آیت ۵۰)

(ترجمہ) پس اس کے بعد کس کلام پر ایمان لائیں گے۔ (اس لیے کہ اب اور کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی)

مزید ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۔

(پارہ ۱۴، سورۃ ۱۵، آیت ۹)

(ترجمہ) ہم نے خود ہی قرآن کو اتارا ہے اور خود ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

اللہ تعالےٰ نے نزولِ قرآن کی غرض و غایت بھی بیان فرمادی ہے:

ھُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡھُدٰی وَ الۡفُرۡقَانِ ۔

(پارہ ۲، سورۃ ۱، آیت ۱۸۵)

(ترجمہ) وہ (قرآن) انسانوں کیلیے رہنما ہے۔ ہدایت کی روشن صداقتیں رکھتا ہے اور حق کو باطل سے الگ کر دینے والا ہے۔

قرآن مجید کی جامعیت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۔

(پارہ ۱۴، سورۃ ۱۶، ۸۹ آیت)

(ترجمہ) اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری ہے (جو) ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی اور فرمانبرداری کے لیے رحمت اور خوشخبری ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۔

(پارہ ۱۵، سورۃ ۱۷، آیت ۹۰)

(ترجمہ) اور یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی نادر باتیں بار بار بیان کر دی ہیں۔ مگر اکثر لوگوں کو سوائے انکار کے کچھ منظور نہیں۔

تورات، انجیل، زبور اور قرآن میں کم و بیش پانچ پانچ سو سال کا وقفہ ہے۔ قرآن کو نازل ہوئے آج چودہ سو سال گذر چکے ہیں مگر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی، وقت نے اس دعوے کی کہ "قرآن خدا کا آخری کلام ہے" کی تصدیق کر دی ہے۔

قرآن سب کتابوں سے زیادہ پڑھا جاتا ہے

قرآن، قرأ سے مصدر ہے، جس کے معنی پڑھنا ہیں اور قرأ کے اصل معنی جمع کرنا ہیں اور پڑھنے میں حرف ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جاتے ہیں۔ پس ایک معنی کے لحاظ سے قرآن نام اس لیے رکھا گیا کہ تمام علوم اور کتبِ سماوی کی تمام خوبیاں اس میں جمع ہیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ ایک پیشگوئی تھی کہ دنیا کی تمام کتابوں میں پڑھا جانے کے لحاظ سے یہ عدیم النظیر ہوگا۔ چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف مخالفینِ اسلام کو بھی ہے کہ قرآن کے برابر دنیا کی کوئی کتاب نہیں پڑھی جاتی، لاکھوں انسان اس کے حافظ ہیں۔ ان حفاظ میں بچے، بوڑھے، جوان سب شامل ہیں۔ پھر ہر مسلمان پانچ مرتبہ ہر روز اس کا کچھ نہ کچھ حصہ نماز میں پڑھتا ہے۔ دنیا میں ہر وقت قرآن پڑھا اور پڑھایا

جاتا ہے۔

قرآن اپنی اصل زبان اور اصل حالت میں موجود ہے

قرآن کے سوا تمام مذہبی کتابیں اُن زبانوں کو کھو چکی ہیں، جن میں وہ نازل ہوئی تھیں، قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور عربی زبان میں قائم ہے۔ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی قرآن کے ایک زیر، زبر اور شوشے میں فرق نہیں آیا، یہ جوں کا توں قائم ہے۔ موافق و مخالف، سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن میں جس قدر آیات اور سورتیں ہیں وہ من وعن وہی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں۔ یہ عظمت اور احساس دنیا میں کسی کتاب کو خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی حاصل نہیں، خدا نے قرآن کی پوری طرح حفاظت کی ہے۔ یہ قرآن کی صداقت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

قرآن اتحاد بین المسلمین کی بنیاد ہے

قرآن کی یہ پیشگوئی کہ وہ مسلمانوں میں اتحاد کی بنیاد ہے، بالکل درست ثابت ہوئی ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔

(پارہ ۴، سورۃ ۳، آیت ۱۰۳)

(ترجمہ) اور سب کے سب اللہ کی رسّی (عہد) کو مضبوط پکڑ لو، اور نہ تفرقہ نہ کرو۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اتحاد اسلامی کی بنیاد حبل اللہ یعنی قرآن ہے۔ اس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ قرآنِ پاک کے متعلق مسلمانوں کا کبھی باہم اختلاف نہ ہوگا۔ اور سب کے ہاتھ میں ایک ہی قرآن ہوگا کیونکہ اتحاد کی بنیاد اسی چیز پر ہو سکتی ہے جس کے بارے میں اختلاف کوئی نہ ہو۔ یہ صداقت قرآن کا بیّن ثبوت ہے کہ آج چودہ سو برس گزر جانے پر سارے عالم اسلامی میں سُنّی، شیعہ، اہل حدیث، خارجی

سب کے ہاتھ میں قرآنِ کریم ایک ہی ہے۔ اور ایک زیر و زبر تک کا فرق نہیں۔

قرآن، توراۃ اور بائیبل سے نہیں لیا گیا

یہودی اور عیسائی علماء یہ ثابت کرنے میں اپنا پورا زور صرف کر دیتے ہیں، کہ قرآن الہامی کتاب نہیں، بلکہ اس کا بیشتر حصہ توراۃ اور انجیل سے ماخوذ ہے۔

"دروغ گو را حافظہ نہ باشد"

کی ضرب المثل ان پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امی محض تھے اور اپنی مقامی زبان عربی کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غیر مذہبوں کی مذہبی کتابوں سے کیسے استفادہ کر سکتے تھے۔ جبکہ آپ پڑھنا لکھنا ہی نہ جانتے تھے۔

قرآن بائیبل کی اصلاح کرتا ہے

قرآن نے بائیبل یا توراۃ سے کچھ نہیں لیا بلکہ درحقیقت اُن کی اصلاح کی ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ چند لفظوں میں حکمت کے دریا بہا دیتا ہے۔ بائیبل میں مندرجہ ذیل الفاظ:

"تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہو گی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی" (پیدائش)

کے مقابلہ میں قرآن کی اس آیت پر غور کریں:

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۔

(پارہ ۱، سورت ۲، آیت ۱۲۴)

(ترجمہ، ابراہیم نے کہا کہ میری اولاد سے؟ فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔)

بائیبل کے الفاظ عام ہیں اور قرآن کا ایک ایک لفظ حق و صداقت کا خزانہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم تیری اولاد کو عزت بخشیں گے بشرطیکہ وہ ظلم کی طرف نہ جھک گئی اور راہِ راست پر گامزن رہی۔

سید سلیمان ندوی اس نقطے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہودیوں میں حضرت موسٰے علیہ السلام کے عہد سے ۶۰۰ء تک جو ظہورِ اسلام کا زمانہ ہے متعدد کتابیں وحیِ الٰہی یا قوتِ انسانی سے ترتیب پائیں اور چونکہ قرآن مجید اور یہ کتبِ اسرائیلیہ ایک ہی مقصد سے انسان کو دی گئیں اس لیے ان میں اکثر حالات و قصص کا باہم اشتراک ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب نکتہ وہ اضافہ و اسقاط ہے، جو قرآن نے ان کتابوں کے مطابق میں کیا ہے۔ جہاں قرآن نے اسقاط کیا ہے وہ شے وحیِ الٰہی یا مقصودِ قرآنی سے خارج تھی اور ہر شخص کو نظر آئے گا کہ وہ خارج کرنے کے لائق تھی۔ اور جہاں اضافہ ہے درحقیقت وہ اس واقعہ کا اصل نقطہ تھا جن کو ان کتابوں نے جن میں انسان کے ہاتھ نے کام کیا ہے، گرا دیا تھا اور قرآن نے جو تکمیلِ کتب اور تصدیق و تصحیح وحیِ اوّلین کے لیے آیا تھا اس کو اپنے موقعہ پر جگہ دی"۔

(سید سلیمان ندوی: ارض القرآن صفحہ ۴۲)

اسلام کے لغوی معنی

اسلام: مادہ س ل م سے باب افعال۔ مسلم کے مندرجہ ذیل معنی قابلِ ذکر ہیں:

(۱) ظاہری اور باطنی آلائشوں (آفات) اور عیوب سے پاک (خالص و محفوظ ہونا)۔

(۲) صلح ہونا امن۔ (۳) سلامتی (۴) اطاعت و فرمانبرداری۔

سَلَم (بہ فتحِ لام) اور سَلْم (بہ سکونِ لام) کا مفہوم اسلام، السلام، انقیاد، اذعان، سپردگی، فرمانبرداری اور اطاعت ہے۔

ان میں سے خالص، پاک اور بے عیب ہونے کے معنی خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔۔۔ لفظ السلام میں بھی جو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ہے ہر کمزوری سے

پاک (خالص) ہونے کا مفہوم موجود ہے ، اسی طرح سلام بمعنی دعا ہے ، کیونکہ یہ بھی آفت اور مکروہ و منکر سے پاک (خالص) کرنے کے لیے ہوتی ہے ...... لفظ اسلام میں جو اَسْلَمَ کا مصدر ہے وہ سب مفہوم شامل ہیں جو شروع میں بیان ہوئے ہیں اور ان میں خالص ہونا یا کرنا بھی شامل ہے ۔ لہٰذا اسلام کے ایک معنی ہیں : عبادت، دین اور عقیدے کو اللہ کے لیے خالص کرنا نیز بمعنی اَسْتِسْلَام ، انقیاد ، اطاعت اور فرمانبرداری۔

اسلام کے شرعی معنی

علمائے اسلام کے نزدیک لفظ اسلام کے شرعی معنی بھی اس کے لغوی معنوں سے نکلتے ہیں اور دونوں کا باہم مضبوط تعلق ہے ۔ اہلِ لغت کے مطابق اسلام کا اصطلاحی شرعی مفہوم اظہار اطاعت و تسلیم ، اظہار شریعت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت تمسک ہے ...... حدیث میں شرعی معنوں کی تشکیل و تفصیل اس فرمانِ نبوی میں ہے جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ۔ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ناگاہ ایک شخص ظاہر ہوا ، جس کے کپڑے بہت اُجلے اور سفید اور بال نہایت سیاہ تھے ۔ اُس شخص پر سفر کا کچھ اثر معلوم نہ ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا کہ یہاں تک کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا اور اُس نے اپنا زانو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا دیا اور اپنی ہتھیلیاں زانوؤں پر رکھ کر عرض کرنے لگا :

"اے محمدؐ ! مجھے بتائیے اسلام کیا ہے" ؟

آپؐ نے فرمایا :

"اسلام یہ ہے کہ تو اس امر کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں کہ یہ کہ تو نماز قائم کرے اور یہ کہ زکوٰۃ دے اور یہ کہ تو رمضان کے روزے رکھے اور یہ کہ اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرے" ۔

اُس شخص نے کہا :

"آپؐ نے درست فرمایا" ۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم اس سے متعجب ہوئے کہ یہ شخص خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی اس کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس شخص نے پوچھا:

"آپ مجھے ایمان سے واقف کیجئے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت پر، اور نیک و بد تقدیر پر ایمان لے آئے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس پر وہ شخص بولا:

"آپ نے سچ فرمایا۔"

پھر اس شخص نے پوچھا:

"آپ مجھے احسان کے بارے میں کچھ بتایئے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ حالت میسر نہ ہو تو کم از کم یہ تو محسوس کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔"

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

"اے عمرؓ! جانتے ہو کہ وہ سائل کون تھا؟"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا:

"اللہ اور اللہ کا رسولؐ بہتر جانتا ہے۔"

اس پر آپؐ نے فرمایا:

"وہ جبریل تھا اور تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آیا تھا"....

اسلام ایک دین ہے

اسلام جامع لفظ ہے۔ اس کی جامعیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کو دین بھی کہا گیا ہے اور دین کل زندگی کے دستور العمل کی حیثیت سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔

دین کے لغوی معنی انقیاد و اخلاص مگر استعارۃً و اصطلاحاً اس سے مراد ملت اور شریعت ہے۔ قرآن مجید میں اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ دِیْنُ الْحَقِّ، دِیْنُ اللّٰہِ۔ اَلدِّیْنُ الْقَیِّمُ کے الفاظ آئے ہیں۔ ۱۰ ہجری جب دین کے کامل ہونے کی خوشخبری سنائی گئی تو اُس وقت بھی اسلام کے لیے دین کا لفظ استعمال ہوا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (پارہ ۶ سورۃ ۴ آیت)

(ترجمہ) آج کے دن ہم نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دی ہیں اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا ہے۔

اسلام عقیدہ و اقرار بھی ہے، عمل بھی اور مکمل ضابطہ حیات اور دستور العمل بھی اور اس کا مجموعی نام دین ہے جس میں (۱) عقائد، (۱) عبادات اور (۲) معاملات (انفرادی، منزلی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، عسکری، عدالتی اور بین الاقوامی) سب شامل ہیں۔ ویسے تو دینِ اسلام سب پیغمبروں نے پیش کیا جس میں اتحاد باعتبار اصولِ دین ہے اور اختلاف باعتبار فروع کے۔ لیکن اسلام سے مراد وہ شریعت اور دین ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے بھیجا۔

{ ماخوذ از "اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ" زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور جلد دوم صفحات ۶۷۰ - ۶۶۷ }

اسلام کائنات گیر ہے

اسلام عالمگیر نہیں، عوالم گیر دین ہے۔ یہ صرف اسی کرۂ ارض کا دین نہیں بلکہ جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے سب کا دین ہے۔ اسلام کے اصل معنی اطاعت و فرمانبرداری ہے اور دین کی اصطلاح میں قوانینِ شریعت کی اطاعت کا نام اسلام ہے پس اسلام ذی حیات اور غیر ذی حیات جمیع مخلوقات کا دین ہے۔ چھوٹے سے ذرّے سے لے کر بڑے سے بڑے سیارے تک سب اللہ تعالیٰ کے قوانین کے پابند ہیں۔

اس آیت پر غور فرمایئے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ

فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ
وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۔

(پارہ ۱۷، سورت ۲۲، آیت ۱۸)

(ترجمہ: کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہیں جو آسمانوں میں
اور جو زمین میں ہیں، اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ
اور درخت اور جاندار اور بہت سے لوگ (بھی))

اسلام اور وحدتِ انسانی

اسلام کی ابتدا ہی جہانوں کی ربوبیت سے ہوتی ہے۔ عربوں میں ربوبیت کے معنی پالنے یا پرورش کرنے کے ہیں۔ پرورش بدوں شفقت و محبت ممکن نہیں کسی چیز کو مختلف مراحل سے اتفاقاً گزار کر حدِ کمال تک پہنچانا ربوبیت کہلاتا ہے۔ یہ حفاظت و نگہداشت کا طویل عمل ہے۔ جس رب کو اہلِ اسلام مانتے ہیں اس کی ربوبیت مسلمانوں کے لیے مختص نہیں۔ وہ بلا امتیاز سب کا پالنہار ہے وہ رب المسلمین نہیں، رب العالمین ہے اور یہی چیز وحدتِ انسانی کی اصل بنیاد ہے۔

توحید

تمام اسلامی [illegible] کلمہ طیبہ پر ہے۔ کلمہ طیبہ کے دو جزو ہیں: "لا الہ الا اللہ" اور "محمد الرسول اللہ"۔ پہلے جزو میں ذاتِ باری تعالیٰ کی وحدانیت اور دوسرے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بیان ہے۔ کلمہ طیبہ چند لفظوں پر مشتمل ہے لیکن اپنے مطالب و مفاہیم کے اعتبار نسلِ انسانی کے تمام مسائل اور ان کے حل پر محیط ہے۔

الہٰ واحد

سب [illegible] یقین کرنا ضروری ہے۔ عرب دور جاہلیت

میں اللہ کا لفظ اپنے معبودانِ باطل کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اللہ کے اصل کے متعلق مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے کیمطابق اس کا اشتقاق اَلَہَ سے ہے جس کے معنی ہیں اُس نے عبادت کی اور اللہ کے معنی معبود ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں اس کی اصل اَلِہَ سے بتاتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

نوعِ انسانی کے دینی تصورات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے مظاہر فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اس پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لیے وضع ہو گئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی، الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا چلا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی وہ ایک ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ اس لیے دیوتاؤں کی ہستی کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصور بھی کم و بیش موجود رہا اور اس لیے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور اُن کی معبودانہ صفتوں کے لیے پیدا ہوئے، وہاں کوئی نہ کوئی ایسا لفظ بھی مستعمل رہا جس کے ذریعے اُس اَن دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

چنانچہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ابوالکلام آزاد اللہ کی اصل اِلٰہ بتاتے ہیں جس کے معنی تحیر و درماندگی کے ہیں۔ کیونکہ خالق کائنات کے متعلق انسان جو کچھ جانتا ہے اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں، وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور و خوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ وہ معلوم کرلے گا کہ اس کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہے۔

سید نذیر نیازی اپنی تحقیق کا نتیجہ "اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ" میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تیسرا خیال یہ ہے کہ اس کی اصل لاَدَ ہے۔ جس کے معنی ہیں آنکھوں

سے غائب ہو گیا۔ اس سے بلندی اور برتری کا مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے یوں الٰہ کے معنی ہوئے وہ ہستی جو ہمارے حدِ فہم و ادراک سے پوشیدہ اور بلند تر ہے۔ الٰہ کے یہی صفاتی معنی ہیں جس کی بنا پر قرآن مجید نے بار بار یہ اصرار کیا ہے کہ اصل معبود (الٰہ) صرف تعالیٰ ہے۔

اللہ وہ اعلیٰ اور بلند ترین ذات ہے، تمام حقائق کمالات کا سرچشمہ ہے وہ حیّ و قیوّم اور قادرِ مطلق ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اس کے اسم ذات (اللہ) کا مترادف موجود نہیں۔

نزولِ قرآن سے پہلے یہ عقیدہ عام تھا کہ اللہ کے سوا اور بھی معبود (الٰہ) ہیں یا یہ کہ اُس کے شریک ہیں، اُس کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں اور وہ خون اور گوشت کا محتاج ہے، مذاہبِ عالم کی صورت مسخ ہو رہی تھی، پروہت، پادری، جاگیردار سب معبود تھے۔ معبودوں کی کوئی کمی نہ تھی، حتیٰ کہ دولت، قوت، منصب، حرص و آز سب معبود تھے۔ قرآن نے معبودانِ باطل کی نفی کی اور اعلان فرمایا:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

(ترجمہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ (پارہ ۲ سورت ۲ آیت ۱۶۳)

(ترجمہ: اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بے انتہا رحم والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

واحد۔ وحدۃ کے معنی اکیلا ہوتا ہے۔ واحد فی الحقیقت وہ ہے جس کی کوئی جزو نہ ہو، جس کا کوئی نظیر نہ ہو اُس کو بھی واحد کہتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں واحد ہو تو اُس کے معنی وہ ذات ہوتی ہے جس کا نہ کوئی جزو ہو سکتا ہے اور نہ ہی جس میں کثرت ہوتی ہے۔ اس آیت میں ایک طرف واحد کہہ کر یہ بتادیا کہ نہ اُس کا

کوئی تجزیہ ہو سکتا ہے، نہ اُس کی ذات میں کثرت ہے اور نہ اُس کی صفات میں اس کا کوئی شریک ہے تو دوسری طرف اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کہہ کر بتا دیا کہ وہی انسان کا حقیقی مطلوب و مقصود ہے اس لیے وہ ایک ہی عبادت کے لائق ہے، وہ ذات میں بھی واحد ہے اور صفات میں بھی اور عبادت میں بھی، مگر وہ انسانوں سے بے تعلق بھی نہیں کیونکہ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔

سورۃ البقرہ میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:
اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔

(پارہ ۳۔ سورت ۲، آیت ۲۵۵)

(ترجمہ) اللہ، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہمیشہ زندہ خود قائم اور قائم رکھنے والا ہے۔

الحی ۔ وہ جس کے لیے ہمیشہ کی زندگی ہے اور زندگی کا سرچشمہ ہے۔ قیّوم مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی اپنی ذات میں قائم رکھنے والا ہے۔

توحید کی اہمیت

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (توحید) کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ: "تمام نیکیوں میں وہ بمنزلہ قلب کے ہے جس کی صحت وسلامتی اور صلاحیت تمام جسم کی فلاح و نجات کا موجب ہوتی ہے لیکن اس میں فساد و اختلال آ جائے تو سارے جسم کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے"۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے حق میں جس کی موت توحید پر ہوئی بلا شرط جنّت کی بشارت دی ہے۔ ارشاد ہے کہ "جو شخص اس حالت میں مر جائے جب کہ وہ خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہراتا ہو وہ جنّت میں داخل ہوگا"۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ "ایسے شخص پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ کو حرام کر رکھا ہے"۔ بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ "اس کو جنّت میں داخل ہونے

سے نہیں روکا جائے گا۔" ایک حدیث قدسی ہے کہ "جو شخص اتنے گناہ کر کے میرے پاس حاضر ہو، جس سے کہ زمین بھر سکتی ہو، لیکن اُس نے شرک نہیں کیا، تو ایسے شخص کا اتنی ہی عفو و مغفرت کے ساتھ خیر مقدم کروں گا جتنے کہ اس نے گناہ کیے ہیں۔"

(حجۃ اللہ البالغہ مترجم مولوی عبدالرحمٰن مرحوم صفحہ ۲۴۸)

توحید اخلاقی فضائل کا سرچشمہ ہے

توحید محض عہد و اقرار نہیں، محض شعور عقلی نہیں بلکہ ایک عظیم ترین اخلاقی قوت ہے، جو داخلی طور پر وجدان و عرفان اور خارجی طور پر عمل صالح اور اخلاق مکارم کا اظہار ہے۔ یہ عقیدہ کہ موت و حیات، عزت و ذلت اور عسر و یسرت سب اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے، انسان کو کندن بنا دیتا ہے۔ چوری کا ارتکاب اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ کی ربوبیت پر ایمان نہیں ہوتا۔ جھوٹ اس لیے بولا جاتا ہے کہ سچ بولنے سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ ظالم کے سامنے اس لیے جھکا جاتا ہے کہ وہ طاقتور ہے۔ لیکن اگر یہ عقیدہ ہو کہ اللہ کے سوا کوئی نفع و نقصان پہنچانے پر قادر نہیں، تو معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ ایمان باللہ حزن و خوف کا قلع قمع کرتا ہے، حرص و آز کی بیخ کنی کرتا ہے اور بزدلی و پست ہمتی کا خاتمہ کرتا ہے۔

توحید ایک کیفیت ہے، جب یہ قلب و رُوح پر طاری ہوتی ہے تو زندگی میں ایک نظم، ایک ضبط اور ایک مقصد پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تفریق و انتشار کے خارزاروں سے نکل کر جمعیت و مرکزیت کے مرغزاروں میں داخل ہو جاتی ہے۔ توحید پرست کو نہ شہنشاہوں کا جلال مرعوب کر سکتا ہے اور نہ ناتوانوں کی کمزوری مشق ستم کی ترغیب دیتی ہے۔ جب مسلمان توحید کی قوت سے مسلح تھے تو قیصر و کسریٰ کے تخت ان کے قدموں میں تھے، اور یتیموں اور بے کسوں کے سروں پر ان کا دستِ شفقت تھا۔ توحید پرست، نڈر، بے باک، پاک باز، باطل شکن، حق شناس اور حق گو ہوتا ہے، اُس کی گردن جھکتی ہے تو اللہ کے آگے، وہ مدد مانگتا ہے تو اللہ سے، جیتا ہے تو اللہ کے لیے مرتا ہے تو اللہ کے لیے۔ غرض اس کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا سب اللہ کے لیے ہوتا ہے۔

توحید اور وحدتِ انسانی

معاشرے کی ہیئت ترکیبی اور تصورِ الوہیت باہم مربوط ہیں۔ وحدتِ انسانی کا مصدرِ اعلیٰ وحدتِ الوہیت کا عقیدہ ہے، جہاں یہ ناپید ہے وہاں وحدتِ انسانی بھی ناپید ہے۔ زرتشتیت کا تصورِ الوہیت خیر و شر کی دو متقابل قوتوں میں بٹا ہوا ہے۔ ہندو مت میں قدرت کی تمام قوتیں الوہیت کے مقام پہ فائز ہیں۔ بدھ مت ذاتِ باری تعالیٰ کے تصور سے عاری ہے۔ عیسائیت تثلیث کے پیچ میں گرفتار ہے۔

ہندو مت اپنے ماننے والوں کو چار طبقوں میں تقسیم کرتا ہے اور نہ ماننے والے کو اچھوت سمجھ کر نفرت کرتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت نے انسانیت کو ... ونسل کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے بنا رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم نہیں۔ یہ تو مذہب ... ت ہے جن میں کسی نہ کسی صورت میں الوہیت کا تصور موجود ہے۔

اب رہا مادہ پرستوں کا معاملہ ... وہ انسان کو فطرت کی سوتیلی اولاد سمجھ کر نفرت کرتے ہیں۔ اور اسے حقیر میکانیہ یا ادنیٰ ترین عاملِ پیدائش خیال کرتے ہیں۔

مسخ شدہ مذاہب کے تصورات ہوں یا مادہ پرست فلسفیوں کے نظریات ان سب میں یہ قدرِ مشترک ہے کہ وہ ایک خاص گروہ یا طبقے کی وکالت کرتے ہیں۔ اور زندگی کا ایک رُخ دیکھتے ہیں۔ ہندو دھرم میں برہمن، عیسائیت میں پادری، سوشلزم میں مزدور اقتدار کا منبع ہے۔ افلاطون جمہوریت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اس کا خیال تھا کہ ایتھنز والوں نے جمہوری طرزِ معاشرت کے باعث سپارٹا کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔

فرد کی زندگی دو طرح کی ہوتی ہے، انفرادی اور اجتماعی افلاطون فرد کی انفرادی زندگی کو نظر انداز کرتا ہے۔ اُس کے نظریہ کے مطابق عورت کی کوئی انفرادی زندگی نہیں، وہ سب کا مشترکہ ہے اور صرف فلسفی ہی ملک کی سربراہی کا اہل ہو سکتا ہے۔

نطشے مساوات اور اخوت کے تصورات کے ساتھ جمہوریت کو بھی رد کرتا ہے
اس کے خیال میں فوق البشر انسانوں کو اس بات کا حق ہے کہ وہ عوام پر حکومت
کریں، وہ کہتا ہے:

"گنگرو کو آدمی سے کیا نسبت ہے۔ وہ انسان کے سامنے مضحکہ خیز دکھائی
دیتا ہے جیسے عام آدمی عظیم انسانوں کے سامنے"

نطشے نے جابجا عورت کا ذکر انتہائی حقارت سے کیا وہ کہتا ہے:

"عورت مرد سے زیادہ چالاک اور خبیث ہے"

"حقیقی مرد دو چیزوں کا خواہش مند ہوتا ہے۔ خطرہ اور تفریح، اسی
لیے وہ عورت کی خواہش کرتا ہے کیونکہ عورت تفریح کا سب سے
خطرناک سامان ہے"

نطشے معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے:
فوق البشر اور عوام۔ فوق البشر حکمرانی کے لیے ہیں اور عوام ابدی غلامی
کے لیے۔

فرائڈ اور مارکس کے فکر و فلسفہ کی بنیاد نفرت اور اشتہا پر ہے۔ فرائڈ جنسی بھوک
کی تسکین اور مارکس پیٹ کی بھوک کی تسکین کو انسانی زندگی کا مقصد وحید قرار دیتا ہے
فرائڈ کے خیالات نے جنسی بے راہ روی پیدا کی ہے اور مارکس کے نظریات نے معاشرے کے
مختلف طبقوں میں نفرت و عداوت کا بیج بو دیا ہے۔

اسلام کے مطابق نوع انسان کے تمام افراد کی اصل ایک ہے اور وہ امت
واحدہ ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ
وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا
وَنِسَاءً۔ (پارہ ۴ سورت ۴ آیت ۱)

(ترجمہ) اے لوگو! اپنے اس رب کی اطاعت کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل
سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت

سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔

(پارہ ۱۱، سورت ۱۰، آیت ۱۹)

(ترجمہ) اور سب لوگ ایک ہی امت ہیں ۔

ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے تمہیں نفس واحد سے پیدا کیا گویا تم ایک ہی کنبہ کے لوگ ہو، چنانچہ تم سب کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں، اس فرمان میں بڑی بھاری صداقت ہے اور یہ نسل انسانی کے اتحاد کی بنیاد ہے۔ مادہ پرست کہتے ہیں کہ سب انسان ایک ماں باپ سے پیدا نہیں ہوئے کیونکہ رنگت، قد وقامت اور خط و خال کے فرق بہت زیادہ ہیں۔ ایک یورپین خواہ کتنی مدت افریقہ میں رہے اور خواہ کتنی بھی سیاہی اس کی رنگت پر آجائے مگر وہ پورا حبشی کبھی نہیں بن سکتا اور نہ ایک حبشی یورپ میں رہ کر یورپین کی رنگت اور خط و خال حاصل کر سکتا ہے، مگر تعجب ہے کہ مادہ پرست جو بندر اور انسان کو متحد الاصل مان سکتے ہیں۔ ایک یورپین انسان اور ایک حبشی انسان کو متحد الاصل نہیں مان سکتے۔ دراصل مادہ پرست نسل انسانی میں ایک تفریق قائم کرنا چاہتے ہیں کہ سب نسل انسانی کے حقوق مساوی نہ سمجھے جائیں جب تک نسل انسانی کا اتحاد قائم نہ ہو اُس وقت تک تفریقات قومی مٹ نہیں سکتیں۔ انسان کا مقصد یہ ہے کہ سب نسل انسانی ایک ہو جائے اور سب تفریقات قومی مٹ جائیں، دنیا میں صرف اسلام ہی اتحادِ نسل انسانی کا داعی ہے اور توحید اس کے بہترین بنیاد ہے۔

توحید اور اخوت و مساوات

توحید کا تصور ایک ایسی ذات سے وابستہ ہے جو لا محدود ہے۔ چنانچہ اس سرچشمہ سے پھوٹنے والی تمام قدریں آفاقی اور کائناتی ہیں۔ توحید کا عقیدہ اپنی اصل کے اعتبار سے کسی محدود تصور کا متحمل نہیں۔ وجہ ظاہر ہے، اللہ سب کا ہے، اور سب اُس کے ہیں، سب ایک دوسرے سے وابستہ و منسلک ہیں اور حقوق میں برابر ہیں۔ نسل انسانی کی شیرازہ بندی اسی عقیدہ سے ممکن ہے کیونکہ یہاں ذات پات اور رنگ و

نسل کی تفریقات کا گزر ممکن نہیں۔

یہ اسلامی اخوت کا کرشمہ تھا کہ دشمن دوست بن گئے اور بیگانے اپنے ہو گئے، رنگتوں کا اختلاف، زبانوں کا تباین، قومیت کا تفرقہ، حسب ونسب کا امتیاز سب جاتا رہا۔ حضرت عمر فاروقؓ جن کی ہیبت سے قیصر و کسریٰ لرزہ براندام تھے، زر خرید غلام بلال حبشیؓ کو سیدنا (سردار) کہہ کر پکارتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد حضرت بلالؓ کعبے کی چھت پر چڑھ کر اذان دیا کرتے تھے جب سرداران قریش کو یہ بات ناگوار گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ۔ (پارہ ۲۶ سورۃ ۴۹ آیت ۱۳)

(ترجمہ) اللہ کے نزدیک وہی مکرم ہے جو متقی ہے۔

اسلام کے میزانِ مفاخرت میں تقوے کے سوا کسی شے کا وجود نہیں، بزرگی اور عزت کا معیار منصب یا خاندان نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ سے مراد خشیتِ ربی کے تحت ہر گناہ سے اجتناب ہے۔

اخوت اسلامی معاشرے کی جان ہے، جس کی بدولت وہ مساوات ظہور پذیر ہوئی جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اور مل بھی کیسے سکتی ہے۔ انسانی ذہن گروہی میلانات، طبقاتی تعصبات اور قومی تفریقات کی تنگنائے میں مقید ہے، اسلامی تصور روحانی ہے اور تمام نسلِ انسانی پر محیط ہے۔

یوں تو مساواتِ اسلامی معاشرے کے تمام احوال و مظاہر میں منعکس ہے لیکن اس کی مکمل ترین مثال حج کے دنوں میں ملتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر مختلف اقوام اور مختلف افراد کی شخصی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ امیر جبلہ بن غسانی، جس نے حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا، ایک بار حج کے دوران کعبے کا طواف کر رہا تھا کہ اچانک اس کی چادر کے کونے پر ایک بدوی کا پاؤں جا پڑا، جبلہ نے طیش میں آکر اس بدوی کے ایک تھپڑ مارا، اُس بدوی نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی، انھوں نے فیصلہ دیا کہ جوابًا وہ بدوی بھی امیر جبلہ کے ایک تھپڑ مارے۔ اس پر جبلہ نے کہا کہ ہم تو وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے گستاخی کے ساتھ پیش آئے تو وہ قتل کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"جاہلیت میں ایسا تھا، مگر اسلام نے شاہ و گدا اور پست و بلند کو ایک
کر دیا ہے۔"
جبلہ نے کہا:
"اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز نہیں تو
اس سے باز آتا ہوں۔"
مگر حضرت عمرؓ نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

رسالت

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور قدسی اُس وقت ہوا جب مطلع عالم پر ظلمت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور پوری انسانیت تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، جگہ جگہ صنم خانے آباد تھے، شرک و الحاد کا دَور دَورہ تھا، فسق و فجور دن رات کا مشغلہ تھا اور قتل و جدال عام بات تھی۔

عرب کی حالت بدترین تھی، بیٹی کا پیدا ہونا مصیبت سمجھا جاتا تھا، لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینے کی رسم عام تھی، ایک آدمی جتنی عورتوں سے چاہتا شادی کر لیتا اور جب وہ مر جاتا تو دوسری جائداد کی طرح اس کی بیویاں اُس کے وارث کی ملکیت ہو جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے درجہ کو بلند کیا، دختر کشی کی ممانعت فرمائی، عورتوں کو جائداد کا حق دیا اور بیویوں کی تعداد مقرر فرمائی اور شرط عائد کر دی کہ ایک سے زائد بیوی وہ کر سکتا ہے جو تمام بیویوں کے ساتھ پورا انصاف کرے۔

ایسے عالم میں دعوتِ حق مخالفت کے طوفانوں کو دعوت دینے کے مترادف تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ کام کسی ایسی ہستی کے سپرد کیا جو یتیم پیدا ہوئی تھی اور قلیل عرصہ بعد ماں کی شفقت سے بھی محروم ہو گئی۔ اب نہ باپ کا سایہ تھا نہ ماں کی شفقت۔ جو شخص بنی نوع انسان کا سہارا بن کر آیا ہو اُسے کسی کے سہارے کی بھلا کیا ضرورت ہے، بچپن سے اعلانِ نبوت تک زندگی اتنی بے داغ کہ لوگوں نے زندگی کی قسمیں کھائیں۔
فراست کا یہ عالم کہ ہر مشکل آنِ واحد میں حل ہو۔

کعبۃ اللہ کی تعمیرِ نو ہو رہی تھی، حجرِ اسود کو اُس کے مقام پر نصب کرنے کا مسئلہ

درپیش تھا۔ قبائل میں اس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ اُسے اٹھا کر دیوار میں لگانے کا شرف کس کو حاصل ہو۔ ہر قبیلہ فضیلت کا مدعی تھا۔ عجب نہ تھا کہ نوبت کشت و خون تک پہنچ جاتی، آخر اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ اس بات کا فیصلہ اُس شخص پر چھوڑ دیا جائے جو آئندہ صبح سب سے پہلے کعبہ کی طرف آتا دکھائی دے۔ اگلی صبح ایک نوجوان کعبہ کی طرف آتا نظر آیا سب پکار اُٹھے :

"الامین آگیا، اس کا فیصلہ ہم سب کو منظور ہوگا۔"

یہ نوجوان حضرت محمد صلعم تھے۔ آپ نے ایک چادر منگوائی، حجرِ اسود اس کے درمیان رکھ دیا۔ تمام قبیلوں کے سرداروں کو کہا کہ چادر کو کونوں سے اٹھا کر دیوار تک لے جائیں۔ اس طرح جب حجرِ اسود دیوار تک پہنچ گیا تو آنحضرت نے خود اس پتھر کو اٹھا کر دیوار میں نصب فرما دیا اور یوں اس جھگڑے کو بخیر و خوبی مٹا دیا جس کا انجام بصورت دیگر خونریزی پر ہوتا۔

آپؐ نے جب اعلانِ نبوت فرمایا تو "امین"، "صادق" کے نام سے پکارنے والے اہلِ مکہ جان کے دشمن ہو گئے۔ کفارِ مکہ نے وہ اذیتیں پہنچائیں، وہ دُکھ دیئے کہ جن کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ان مخالفتوں اور عداوتوں کا آنحضرتؐ پر کیا اثر ہوتا! وہ برابر تبلیغ کرتے رہے، دشمنوں نے راہ میں کانٹے بچھائے، جسمِ اطہر پر غلاظتیں پھینکیں، معاشرتی اور معاشی مقاطع کیا، قتل کے منصوبے تیار کیے، گھر کا محاصرہ کیا، طائف والوں نے پتھر مار مار کر شہر سے باہر نکال دیا اور تھکے ماندے جا کر آپ نے ایک چشمے پر دم لیا تو پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ ساتھیوں نے طائف والوں کے لیے بد دعا کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا:

"میں انسانوں کے لیے قہر و غضب نہیں، رحمت بن کر آیا ہوں۔"

پھر جب مکہ فتح ہوا تو اپنی جان کے دشمنوں کو لا تثریب علیکم الیوم کا مژدہ سنایا۔

انبیاء و رسل احکامِ الٰہی کی تبلیغ کرتے ہیں اور لوگوں کو نیکی و راست بازی کا سبق دیتے ہیں، رسولِ پاکؐ کی ساری زندگی اس حقیقت کی تفسیر ہے۔ انہوں نے غرقِ معصیت انسانیت کو تقویٰ و پرہیزگاری کی راہ پر ڈالا، توحید کا درس دیا اور مختلف گروہوں، اور قبیلوں میں بٹی ہوئی مخلوق کو ملتِ واحدہ میں تبدیل کر دیا۔

شبلی لکھتے ہیں :

" نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اجزائے ذیل سے مرکب ہے - خود کامل ہو، دوسروں کو کامل کر سکتا ہو، اس کے علوم اور معارف اکتسابی نہ ہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں - یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذاتِ مبارک میں موجود تھیں کیا ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی کوئی نظیر مل سکی ہے !

غور کرو جس شخص نے کسی قسم کی ظاہری تعلیم نہ پائی ہو، جس نے آنکھ کھول کر اپنے گرد و پیش بت پرستی کے سوا اور کچھ نہ دیکھا ہو، جس کے کانوں نے ناقوس کے سوا اور کوئی آواز نہ سنی ہو، جس نے الٰہیات، اخلاق، اصولِ معاشرت، قانونِ تمدن کے متعلق ایک حرف بھی کسی سے نہ سنا ہو۔ دفعتاً منظرِ عام پر آئے اور ایک طرف فلسفۂ اخلاق، تزکیۂ روح، الٰہیات، معاد، معاشرت، اصولِ تمدن کے وہ حقائق اور نکات بتائے جو کسی حکیم، کسی فلسفی، کسی مقنن، کسی پیغمبر نے کبھی نہیں بتائے تھے - دوسری طرف تمام قوم کی قوم میں جو اُس وقت جہالت و وحشت، جور و ظلم، فسق و فجور، سفاکی و خونریزی میں ڈوبی ہوئی تھی - پاکیزہ اخلاق اور سچائی کی رُوح پھونک دے کہ دفعتاً اُن کی کایا پلٹ ہو جائے بجز محمد رسول اللہ کے اور کون ہو سکتا ہے -

اسلام اور احترامِ آدمیت

اسلام کے سوا دنیا میں کسی نظامِ حیات، کسی مکتبِ فکر، کسی سیاسی مسلک نے انسان کو قابلِ عزت نہیں سمجھا۔ ہندو دھرم اور بدھ مت نے انسان کی بڑی تذلیل کی ہے۔ یہودیت کی قوم پرستی اور مسیحیت کی لادینیت نے دُہرا ظلم ڈھایا ہے ۔ سوشلسٹوں نے انتہا کر دی ہے۔ اُن کے ہاں اخلاقی قدروں کا کوئی تصور نہیں، چنانچہ اُن کا آئین انسانی حقوق کے تصور سے خالی ہے۔ سوشلسٹ انسان کو فطرت کا تابع محض قرار دیتے ہیں -

یہ امتیاز صرف اسلام کو حاصل ہے کہ وہ انسان کو حرمت و مکرمت کا مستحق گردانتا ہے

قرآن انسان کو فطرت کے احوال و مظاہر میں تفکر کی دعوت دیتا ہے، کتشاف و ایجاد کے بے پایاں امکانات کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے انسان تابع فطرت نہیں بلکہ فطرت تابع انسان ہے۔

مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمایئے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔

(پارہ ۲ سورت ۲ آیت ۱۶۴)

(ترجمہ) آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات اور دن کی تبدیلی میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں کہ اس کے ساتھ لوگوں کو نفع دے، اور پانی میں جو اللہ بادل سے اُتارتا ہے، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اس کے اندر ہر قسم کے جاندار پھیلاتا ہے۔ اور ہواؤں کے اُدل بدل میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان کام پر لگایا گیا ہے، اُن لوگوں کے لیے یقینی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ۔

(پارہ ۱۷ سورت ۲۲ آیت ۶۵)

(ترجمہ) اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا ان سب چیزوں کو جو زمین پر ہیں تمہارے لیے مطیع بنا دیا ہے۔

انسان کو فضیلت کے لحاظ سے تمام مخلوقات میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ

خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (پارہ ۱۵ سورت ۱۷ آیت ۲۰)

(ترجمہ) اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے اس کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے بڑی فضیلت دی ہے۔

اسلام نے انسان کی بحیثیت انسان عزت و حرمت تسلیم کرائی۔ ماں، باپ، بہن، بھائی اور عزیز و اقارب کو انسانی بنیادوں پر اہم مقام دیا، ماں باپ سے انتہائی حسنِ سلوک کا حکم ہے، بیوی کو مرد کا اور مرد کو بیوی کا لباس قرار دیا۔ عورت کو جائداد میں وراثت کا حق دیا اور تقدس بخشا۔ غلاموں کو خاکِ مذلت سے اٹھا کر آزاد آقاؤں کے برابر کر دیا۔ ایک دفعہ حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے نے اپنے قبطی غلام کو بُری طرح پیٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر وہاں سے ہوا اور فرمایا:

"تم نے ان لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا ہے، حالانکہ یہ ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرے مجمع میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کو اُسی غلام کے ہاتھوں پٹوایا کہ سب کو عبرت حاصل ہو۔

اسلام نے ذمیوں (ذمی سے وہ قومیں مراد ہیں جو مسلمان نہ تھیں لیکن ممالکِ اسلام میں سکونت رکھتی تھیں) کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حکم دیا اور ان کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لیا۔

شبلیؒ الفاروق میں لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ نے ذمی رعایا کو جو حقوق دیئے اُس کا مقابلہ اگر اس زمانے کی سلطنتوں سے کیا جائے تو کسی طرح کا تناسب نہ ہوگا۔ حضرت عمرؓ کے ہمسایہ جو سلطنتیں تھیں وہ روم و فارس تھیں۔ ان دونوں سلطنتوں میں غیر قوموں کے حقوق غلاموں سے بھی بدتر تھے۔ شام کے عیسائی باوجودیکہ رومیوں کے ہم مذہب تھے، تاہم اُن کو اپنی مقبوضہ زمینوں پر کسی قسم کا مالکانہ حق حاصل نہیں تھا بلکہ وہ خود ایک قسم کی جائداد خیال کیے جاتے تھے۔ چنانچہ زمین کے انتقال کے ساتھ وہ بھی منتقل ہو جاتے تھے اور مالکِ سابق کو جو

ان پر مالکانہ اختیارات حاصل تھے وہی تو بعض حال کو ہو جاتے تھے۔ یہودیوں کا حال اور بدتر تھا کہ کس حیثیت سے ان پر رعایا کا اطلاق ہو سکتا ؛ کیونکہ رعایا آخر کچھ نہ کچھ حق رکھتی ہے اور وہ حق کے نام سے بھی محروم تھے۔ فارس میں جو عیسائی تھے اُن کی حالت اور رحم کے قابل تھی ''۔

حضرت عمرؓ نے جب ان ممالک کو زیرنگیں کیا تو دفعتاً حالت بدل گئی۔ جو حقوق اُن کو دیئے گئے اس کے لحاظ سے گویا وہ رعایا نہیں بلکہ اس قسم کا تعلق رہ گیا۔ جیسا دو برابر کے معاہدہ کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ بیت المقدس کا معاہدہ جو حضرت عمرؓ کی موجودگی میں اور ان کے الفاظ میں لکھا گیا حسب ذیل ہے :

" یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیرالمومنین عمرؓ نے ایلیا کے لوگوں کو دی یہ امان اُن کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور اُن کے تمام مذاہب والوں کے لیے ہے۔ اس طرح پر کہ نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ اُن کے احاطہ کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور اُن کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ایلیا میں اُن کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے، ایلیا والوں پر یہ فرض ہے کہ اور شہریوں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں کو نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے اُس کی جان اور مال کو امن ہے تاکہ وہ جائے پناہ پر پہنچ جائے اور جو ایلیا ہی میں رہنا اختیار کرے اُس کو بھی امن ہے اور اس کو جزیہ دینا ہوگا۔ اور ایلیا والوں میں جو شخص اپنی جان اور مال لے کر یونانیوں کے ساتھ چلا جانا چاہتا ہے تو ان کو اور ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو امن ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک پہنچ جائیں۔ اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا رسولؐ، خدا کے خلفاء اور مسلمانوں کا ذمہ ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ جزیہ مقررہ ادا کرتے رہیں۔ اس تحریر پر گواہ ہیں خالد بن ولید، عبدالرحمٰن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان اور

۱۵ھ میں لکھا گیا"

اسلامی قانون

اسلام اور اسلامی قانون

پیغمبرِ اسلام کا ظہور گمراہ انسانیت کو راہِ راست پر لانے کے لیے ہوا تھا۔ آپؐ نے بنی نوع انسان کو عدل و مساوات، راست بازی اور عالمگیر اخوّت کی تعلیم دی۔ توحید اور رسالت اسلام کے بنیادی حقوق ہیں، اس لیے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلام اور اسلامی قانون کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی قانون کا ماخذ اسلام ہے اور اسلام کا منبع قرآن ہے جو کلام اللہ ہونے کے باعث مسلمانوں کا قانون ہے۔

پروفیسر گب لکھتا ہے:

"مسلمان علماء کی نگاہ میں اسلامی قانون۔ اُس مذہبی و معاشرتی عقیدہ کا عملی پہلو تھا جس کی تبلیغ حضرت محمد صلعم نے کی"

قرآن عرفی اصلاحی معنوں میں کوئی ضابطہ قانون نہیں۔ یہ تو تمام قوموں، ملکوں اور زمانوں کے لیے ضابطہ حیات ہے، اس کی ہدایت کا تعلق فلاحِ دارین سے ہے۔ قرآنی آیات کی نوعیت چونکہ آفاقی و ابدی ہے۔ اس لیے اکثر معاملات میں جزئیات کا تعین نہیں کیا گیا۔ صرف اصول و مبادی بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اسلامی قانون کی تشکیل

اسلامی قانون کی تشکیل مختلف مراحل میں ہوئی:

پہلا دور

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور آپؐ کی وفات پر ختم ہوتا

ہے۔ اس دَور میں قرآن اور حدیث کی تکمیل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دین کے مکمل کرنے اور حدیث دونوں بنیادی ماخذ ہیں جن پر آئندہ کی فقہی تصریحات کی بنیاد رکھی گئی اس دَور کو بجا طور پر قانون سازی کا دَور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں اسلامی قانون کے مندرجہ ذیل اصول طے ہوئے:

پہلی مرتبہ انتظامیہ کے خط و خال نمودار ہوئے۔ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف تمام مسلمانوں کے مذہبی پیشوا بن گئے بلکہ دنیوی حکومت کے سربراہ بھی تسلیم کئے گئے۔ انصاف، مساوات اور عالمگیر اخوت رہنما اصول قرار پائے۔ تاریخ عالم میں پہلی بار ان اصولوں کو اپنانے کا شرف اسلام کو حاصل ہے۔ جنگ کو اصولی طور پر ختم کر دیا گیا۔ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ جارحیت سے کلی طور پر اجتناب کیا جائے۔ اب جنگ صرف اسلام، اسلامی ریاست اور مسلمانوں کے دفاع کی خاطر لڑی جا سکتی ہے۔

عورتوں کے متعلق اصلاحات کی گئیں۔ اسلام سے قبل عورت کو معاشرے میں کوئی حقوق حاصل نہیں تھے، اُس کو بازار کی ارزاں ترین جنس خیال کیا جاتا تھا۔ اسلام نے عورت کو حقوق و مراعات عطا کیں اور اُس کا حق وراثت تسلیم کیا۔ اس طرح اسلام نے اصولاً و عملاً عورت کو مرد کے ہم مرتبہ بنا دیا۔ اسلام نے نجی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا اور ذاتی محنت کی کمائی کو جائز قرار دیا۔ پہلی مرتبہ اقرار ناموں اور عہد ناموں پر عملدرآمد لازمی قرار دیا گیا۔ یہ فوقیت بھی اسلام کو حاصل ہے کہ حقوق و فرائض کے باہمی تعلق کو واضح کیا اور فرائض کی بجا آوری کو قانونی حیثیت عطا کی۔ اسلام سے قبل حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوئی خط امتیاز نہیں تھا، اسلام نے دونوں کو الگ کیا اور مختلف جرموں کی سزائیں مقرر کیں۔

دوسرا دَور

اسلامی قانون کی تشکیل کا دوسرا دَور پہلے دَور سے کچھ کم اہم نہیں۔ رسالتمآب کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی پاکیزہ زندگیاں مشعلِ راہ ثابت ہوئیں۔ یہ مقدس لوگ تصفیہ طلب امور کا حل قرآن اور حدیث میں تلاش کرتے تھے اور جب کسی مسئلے پر قرآن اور حدیث میں رہنمائی نہ پاتے تو استدلال اور اجماع

کونسل میں لاتے ۔ کسی مسئلے پر علماء کا اتفاقِ رائے اجماع کہلاتا ہے ۔ اس طرح شوریٰ یا غیر شوری طور پر " اجماع " اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ بن گیا ۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب اجماع کے ذریعے عمل میں آیا تھا ۔ اجماع کے بعد " قیاس " چوتھے ماخذ کی حیثیت سے ارتقاء پذیر ہوا ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابوبکرؓ نے قضاۃ کا عہدہ خود سنبھال لیا اور مجرموں کے لیے قید خانے قائم کیے ۔

یہ حضرت ابوبکرؓ کی دُور اندیشی تھی کہ انہوں نے مختصر سے عہدِ خلافت میں قرآن پاک کے نوشتوں کو اکٹھا کر کے قرآن پاک کو مدوّن کیا ۔ تدوین شدہ نسخے کو " مُصحف " کہا جاتا تھا ۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں مصحف کی سات کاپیاں کرائیں اور نظرِ ثانی کر کے املا کی غلطیوں کو درست کیا اس طرح کلام اللہ پوری طرح محفوظ ہو گیا ۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں عدلیہ کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ۔ یہ حضرت عمرؓ ہی تھے جنہوں نے پہلا قاضی مقرر کیا ۔ وہ عدلیہ کی آزادی اور بالادستی کے قائل تھے ۔ اس لیے انہوں نے انتظامیہ سے عدلیہ کی علیٰحدگی کا نظریہ کسی مغربی سیاس اور مقنن کی اختراع نہیں بلکہ حضرت عمرؓ کی معدلت پسندی کا کرشمہ ہے ۔ وہ عدل بین الناس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عدلیہ کی خود مختاری کو ناگزیر خیال کرتے تھے ۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے کسی یہودی کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا تھا ۔ یہودی اور حضرت عمرؓ قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے قاضی حضرت عمرؓ کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو گیا ۔ حضرت عمرؓ نے اس فعل کو سخت ناپسند کیا ۔ اور اس کو قضاۃ کے عہدہ سے برطرف کر دیا ۔ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کی طرح بہت بڑے فقیہہ تھے اور قرآن و حدیث میں گہری بصیرت رکھتے تھے ۔ انہوں نے پہلی مرتبہ قاضی کے فرائض اور دائرہ عمل کا تعین فرمایا ۔

تیسرا دَور

تیسرے دَور میں علی الترتیب بنو اُمیّہ اور بنو عباس برسرِ اقتدار تھے اور دمشق اُن کا دارالسلطنت تھا ۔ بنو عباس کے زمانے میں اہل السنّۃ کے مسالک اربعہ کی باقاعدہ بنیاد پڑی ہے ۔

امام ابو حنیفہؒ حنفی مکتبِ فکر کے بانی تھے اور دوسرے آئمہ کے مقابلے میں اپنی قوت

استدلال پر زیادہ انحصار کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حزب الاحناف کو اہل الرائے کہا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی علمی فضیلت اظہر من الشمس ہے۔ انہوں نے "استحسان" کا اصل مستنبط کیا اور اس کو خوب ترقی دی۔ بعد میں اس اصول کو ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اصولِ استحسان "قیاس" سے مشابہ ہے لیکن دونوں مختلف ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے فقہ کو منضبط علم (سائنس) بنادیا اور اجماع کی اخلاقی حیثیت تمام زمانوں پر پھیلا دی۔ وہ "عرف" یعنی عام رسم و رواج کو بھی تسلیم کرتے تھے۔

امام مالکؒ علم الحدیث میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ اُن کے فتوے کو مستند خیال کیا جاتا تھا۔ امام شافعیؒ جو امام مالک سے بہت متاثر تھے اُن کو علم حدیث کا درخشندہ ستارہ کہتے تھے۔ امام مالک کی مؤطا علم حدیث کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ امام مالک نے "المصلحت" یعنی رفاہِ عامہ کے اصول کو رائج کیا، یہ "استحسان" سے ملتا جلتا ہے۔

امام شافعیؒ اپنے استاد امام مالک سے بلند تر درجہ کے فقیہہ تھے۔ وہ احادیث کی صحت و تصدیق کے متعلق اتنے سخت نہیں تھے جتنے کہ امام ابو حنیفہؒ۔ چنانچہ وہ اُن کے مسلک کے پیروکار اہلحدیث کہلاتے ہیں۔ امام شافعیؒ صرف قرآن، حدیث، اجماع، قیاس اور استدلال کو ماخذ مانتے ہیں، وہ "استحسان" اور المصلحت کے قائل ہیں۔ چنانچہ وہ استدلال کو اسلامی قانون کا آخری ماخذ خیال کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ امام شافعیؒ کے شاگرد تھے وہ شرعی معاملات میں صرف قرآن اور حدیث کو حرفِ آخر مانتے تھے۔ چنانچہ کچھ علماء اُن کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا ہم پلہ خیال کرتے تھے۔

اجتہاد

اسلامی قانون کے تمام ثانوی ماخذ "قیاس" استحسان، المصلحت" اجتہاد کا نتیجہ ہیں کسی مسئلے پر انفرادی رائے کو اجتہاد اور علماء کے اتفاقِ رائے کو "اجماع" کہا جاتا ہے اجتہاد کے معنی کسی قانونی مسئلے کو حل کرنے کے لیے تمام تر ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانا ہے۔ جن معاملات کی وضاحت قرآن، حدیث اور اجماع نہیں کرتے وہاں اجتہاد حرکت حرکت میں آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اجتہاد کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں پہنچتا مجتہد ایسا شخص

ہو سکتا ہے جو قرآن و حدیث میں گہری بصیرت رکھتا ہو، علم فقہ کا ماہر ہو، عربی زبان میں قدرت رکھتا ہو، سلیم الطبع ہو اور راسخ العقیدہ مسلمان ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کی فکری دیانت شک و شبہ سے بالاتر ہو۔ اس تغیّر پذیر حالات کی دنیا میں اجتہاد کی ضرورت رہتی ہے اور اسلام نے یہ دروازہ کبھی بند نہیں کیا۔ جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان اجتہاد کی اہمیت پر لکھتے ہیں:

"عالم امکان میں تغیّر بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے اور جائے تعجب ہوتی اگر اسلامی قانون، جو دینِ فطرت کا حصّہ ہے، اس نشانِ کبریائی کو نظر انداز کر دیتا۔ قرآن مجید کے دیئے ہوئے اصول تبدیلی کی تُند موجوں میں زندگی کی کشتی کے لیے بمنزلہ لنگر کے ہیں جو اُسے غرقابی سے بچاتے ہیں اور دیگر ما خذ بدلے ہوئے حالات کے انجانے سمندروں میں اسے سلامتی کے نئے نئے راستے بتا کر ساحلِ مراد تک لے جانے کے لیے ہادی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ناچیز کی نظر میں دین کی اکملیت کے یہ معنی نہیں کہ ماضی میں قانونِ اسلامی کی تمام تعبیرات، تفصیلات و جزئیات اپنی آخری شکل میں متعین ہو چکیں۔ فقہ کے ائمہ کرام نے کوئی ایسا دعوےٰ نہیں کیا۔ شارعِ اسلام کی حکمت بالغہ نے دینی نظام میں زمانی و مکانی تغیرات کے لحاظ سے ابدی اصولوں کے تحت کافی لچک رکھی ہے۔ اجتہاد کا اصول اسلامی زندگی کے خیراتی تصور کا لابدی عنصر ہے۔ اس کا دروازہ ہر زمانے میں کھلا رہنا چاہیے۔ "الدین یسر" کی روشنی میں خدا کے بندے اُس کی بخشی ہوئی آسانیوں سے فائدہ اٹھا کر زندگی کی ارتقائی منزلوں میں اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔"

جرم و سزا

اسلام میں عقوبات دو طرح کی ہیں: حد اور تعزیر۔ "حد" میں جرم کی سزا متعین ہے اور جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں قاضی اپنی مرضی سے سزا میں کمی و بیشی کو مجاز نہیں۔ "تعزیر" میں سزا کی مقدار اور نوعیت مقرر نہیں۔ اس کا انحصار قاضی کی صوابدید

پر ہے۔

"حد" کے زمرے میں مندرجہ ذیل جرائم آتے ہیں:
زنا، چوری، رہزنی، شراب نوشی، پاک دامن عورتوں پر بہتان تراشی۔ قرآن مجید میں ان کی سزائیں مقرر ہیں:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ (پارہ ۱۸ سورت ۲۴ آیت ۲)

(ترجمہ) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد (کے لیے حکم یہ ہے) کہ دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

بعض روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ زانیہ اور زانی کو ایسے کوڑے سے مارا جاتا تھا جس پر گانٹھ کوئی نہ ہوتی تھی اور نہ کوئی اس کی شاخ ہوتی تھی، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس قسم کے کوڑے کے ساتھ مارنا بھی حضرت عمرؓ کے زمانے میں اجماع صحابہ سے شروع ہوا اور اس سے پہلے کبھی ہاتھ سے مارا جاتا تھا، اور کبھی جوتی سے اور کبھی تازہ شاخ سے۔ پھر یہ مارنا کپڑے اتار کر اور ننگا کر کے نہیں، بلکہ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اس پر ایک یا دو قمیضیں چھوڑ دی جائیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ننگا کر کے مارنا اور شدید مارنا کہ آدمی ادھموا ہو جائے درست نہیں۔

رجم قرآن مجید میں مذکور نہیں البتہ احادیث میں اس کا بیان ہے۔ بیاہوں کی سزا رجم (سنگسار کرنا ہے) اور بن بیاہوں کی سزا سو کوڑے ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا۔

(پارہ ۶ سورت ۵ آیت ۳۸)

(ترجمہ) اور چور مرد اور چور عورت سو دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(ترجمہ) اے لوگو جو ایمان لائے ہو شراب اور جوا اور بت اور پاسے ناپاک کام صرف شیطان کے عمل ہیں، سو اس سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو۔

(پارہ ۷ سورت ۵ آیت ۹۰)

قرآن نے شراب کی سزا مقرر نہیں کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک شرابی کو چالیس دُرّے لگائے تھے اور حضرت علیؓ نے بڑھا کر اسّی دُرّے کر دیئے۔ یہ سزا دراصل تعزیر کے زمرے میں آتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا۔

(ترجمہ) اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی قبول نہ کرو۔

(پارہ ۱۸، سورت ۲۴، آیت ۵)

اسلامی سزاؤں کی نوعیت

ایک عرصہ سے اسلام دشمن عناصر یہ پروپیگنڈا کرتے نہیں تھکتے کہ اسلامی سزائیں بڑی بہیمانہ اور سفاکانہ ہیں۔ اس مذموم کوشش کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کیا جائے۔ حق تو یہ ہے کہ اسلام کے سوا کوئی نظام یا ازم انسانی عظمت و شرف کا علمبردار نہیں۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ یہ واحد نظام ہے جس نے عملی طور پر انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی عقوبات و تعزیرات انسانی معاشرے میں جان و مال کے تحفظ اور عزت و ناموس کی بقا کی غیر متزلزل ضمانت ہیں۔ دفع شر اور قیام امن حکومت کا اوّلین فرض ہے تاکہ عامۃ الناس ذہنی آسودگی کے ساتھ اپنا اپنا کام کر سکیں۔

بعض لوگ تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور سُنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں کہ مذکورہ بالا چند ایسے جرائم ہیں جن کے بارے میں وضاحت کے ساتھ سزائیں مقرر ہیں۔ باقی ایسے جرائم ہیں جن کی سزا کا فیصلہ واقعات کی روشنی میں قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسلام

کا مقصد چونکہ پاکیزہ معاشرے کا قیام ہے، جس میں انسانی شرف اور عظمت محفوظ رہے اس لیے جھوٹی گواہی اور بہتان تراشی ایسے جرائم کی سخت سزائیں مقرر ہیں۔ زنا۔ چوری۔ شراب نوشی معاشرے کے جسم میں ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا قلع قمع معاشرے کے مفاد میں ہے۔

٭ اسلام کے قانونِ شہادت کی نوعیت کچھ ایسے واقع ہوئی ہے کہ معیاری اور کافی شہادت کے بغیر حد جاری نہیں ہو سکتی۔ اسلامی عدالت میں نہ تو پیشہ ور گواہوں کے شہادت پر فیصلے ہوتے ہیں اور نہ محض شک کی بنا پر کسی کو مجرم گردانا جاتا ہے۔ اسلامی قانون میں اُس شخص کی شہادت قابلِ قبول ہے جو صالح ہے۔ اگر شہادتوں میں اختلاف ہو یا معیاری شہادتیں نہ ملیں تو مدعا علیہ سے حلف لیا جائے گا۔ اور اس پر فیصلہ ہوگا۔ قتل کے مقدمات میں مقتول کے وارثوں کو حق دیا جائے گا کہ اگر وہ دیت قبول کر لیں تو موت کی سزا معاف کر دی جاتی ہے۔ اسلامی قانون میں کسی مقدمے کا فیصلہ کرنے سے پہلے انتہائی احتیاط اور پیش بندی سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ گنہگار سزا سے بچ جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی بے گناہ سزا پائے۔

اسلام کا تصوّرِ ریاست

اسلامی حکومت میں کوئی انسان فرمانروا نہیں

اسلام کا قانون غیر شخصی اور غیر طبقاتی ہے۔ اس لیے اس میں نہ مفادات کا تصادم اور نہ شخصیات و طبقات کا تزاحم۔ اس کے دامنِ رحمت میں ہر ملک، ہر قوم، ہر طبقہ، ہر گروہ اور ہر فرد کے لیے بلاتمیز عدل ہے، انصاف ہے اور تحفظ ہے۔ اس کے نظامِ عدل میں کوئی زبردست کسی زیردست پر زیادتی نہیں کر سکتا، کوئی طاقتور کسی کمزور کا حق نہیں چھین سکتا۔ اسلام ظلم و استبداد کا قلع قمع کرتا ہے اور حق و انصاف قائم کرتا ہے ؎

قوی اگر ہو سامنے تو قہرِ ذوالجلال بن
ضعیف اگر ہو سامنے، رسولؐ کا جمال بن
خدا کے آگے سر جھکا کہ سرکشوں کا سر جھکے
قضا ستمگروں کی ہو ستم زدوں کی ڈھال بن (ظفر علی خاں)

اسلام کی حکومتِ الٰہیہ میں کوئی انسان فرمانروا نہیں، سب تابعِ فرمان ہیں، کوئی خلیفہ یا امیر اپنے ذاتی مفادات یا کسی خاص طبقہ یا گروہ کے مفادات کی خاطر قانون میں ردّوبدل کا مجاز نہیں، اس طرح کوئی فرد خواہ کوئی ہو اپنی بداعمالیوں کی جوابدہی اور سزا سے نہیں بچ سکتا، قانون کی گرفت سے کوئی آزاد و مستثنیٰ نہیں۔

اسلام کے نظامِ حیات میں نہ قیصریت ہے نہ کسرائیت، سرمایہ داری ہے نہ سرمایہ پرستی، اشتراکیت ہے نہ اشتراکیت کی انسانیت کشی، فوق البشر ہے نہ اس کی خدائی و ستم رانی، قانون کے سامنے سب ایک قطار میں کھڑے ہیں، نبیؐ ہو کر نبیؐ کی بیٹی، خلیفہ ہو کر اُس کا بیٹا، حاکم ہو کر اس کا قریبی، سب تابعِ فرمانِ الٰہی ہیں، سب جواب دہ ہیں اور

سب پابندِ قانون۔ کارلائل لکھتا ہے:

"وہ (محمدؐ) اپنی وفات سے دو روز قبل آخری مرتبہ مسجد گئے اور لوگوں سے کہا:

"اگر کسی شخص کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہے تو میری پیٹھ حاضر ہے تاکہ وہ اپنے ہاتھ سے کوڑے لگا سکے۔"

پھر سوال کیا:

"کوئی ایسا شخص ہے جس کا مجھ پر قرض ہے۔"

ایک شخص نے جواب دیا:

"ہاں! تین دینار جو آپ نے فلاں وقت لیے تھے۔"

محمدؐ نے حکم دیا کہ تین درہم ادا کر دیئے جائیں۔ محمدؐ نے فرمایا:

"قیامت کے دن شرمندہ ہونے سے بہتر ہے کہ اسی دنیا میں شرمندہ ہو لیا جائے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح وفات سے قبل اپنے آپ کو جواب دہی کے لیے عامۃ الناس کے سامنے پیش کیا تھا، بالکل اسی طرح اعلانِ نبوت سے قبل اپنی دیانت و امانت کے متعلق جمہور کی شہادت طلب فرمائی تھی۔

"ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر لوگوں کو پکارنا شروع کیا، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"تم مجھے بتاؤ کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا جانتے ہو؟"

سب نے ایک آواز ہو کر کہا:

"ہم نے کوئی بات غلط یا بیہودہ تیرے منہ سے نہیں سنی، ہم یقین کرتے ہیں کہ تو امین و صادق ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" دیکھو میں پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں اور تم سب اس کے نیچے ہو۔ میں یہاں سے اِدھر بھی دیکھ رہا ہوں اور اُدھر بھی نظر کر رہا ہوں۔ اچھا اگر میں یہ کہوں کہ رہزنوں کا ایک مسلح گروہ دُور سے نظر آ رہا ہے جو مکہ پر حملہ آور ہو گا کیا تم اس کا یقین کر لو گے؟"

لوگوں نے کہا :

" بیشک! کیونکہ ہمارے پاس تجھ جیسے آدمی کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں خصوصاً جب کہ وہ ایسے بلند مقام پر کھڑا ہے کہ دونوں طرف دیکھ رہا ہے"

{ رحمت اللعالمین، جلد اوّل، صفحہ ۶۰
مؤلفہ، قاضی محمد سلیمان منصور پوری }

کیا تاریخ عالم ایسی مثال پیش کر سکتی ہے یا کبھی کر سکنے کا امکان ہے؟

حضرت فاطمہؓ بنت رسولؐ کے ہاتھوں میں چکی پیس پیس کر چھالے پڑ گئے تھے۔ ایک دن بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا :

" دیکھیے! ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ مالِ غنیمت میں کئی غلام اور کنیزیں آئی ہیں، گھر کے کام کے لیے ایک عنایت فرما دیجئے"

حضورؐ نے جواب دیا :

" نہیں بیٹی! ان پر سب مسلمانوں کا حق ہے، یہ مال ہمارا نہیں، گھر کا کام بدستور خود کیا کرو اور جب تھک جایا کرو تو خدا کو یاد کر لیا کرو"

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

" بھائیو! اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو تم کیا کرو گے؟"

ایک آدمی نے کھڑے کھڑے ہو کر کہا :

" ہم تمہارا سر قلم کر دیں گے"

حضرت عمرؓ نے اس کے ایمان کی آزمائش کرنے کی خاطر کہا :

" تم نے ایسے گستاخانہ الفاظ میرے لیے استعمال کرنے کی جرأت کی ہے"

اُس شخص نے جواب دیا :

" ہاں! تیرے لیے"

حضرت عمرؓ اُس شخص کی دلیری سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

"شکر ہے خدا کا! کہ امتِ مسلمہ میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو وہ مجھے درست کر سکتے ہیں"

ایک دن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نماز کے بعد زار زار رو رہے تھے اُن کی بیوی فاطمہ نے اس طرح رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا:

"مجھے ایک وسیع سلطنت کا خلیفہ بنا دیا گیا ہے۔ جس میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ سلطنت میں سینکڑوں غریب، نادار، بیمار اور پریشان حال ہیں میں سوچ رہا تھا کہ جب قیامت کے دن خدا ان مصیبت زدہ لوگوں کے متعلق سوال کرے گا تو کیا جواب دوں گا؟"

اسلام کا نظریۂ حاکمیت

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو دین وحیِ قرآن کی صورت میں نازل ہوا ہے وہ ایک خدائی ضابطہ ہے، چنانچہ اسلام کے تصورِ ریاست کی بنیاد اس ابدی صداقت پر استوار ہے کہ حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے حکومت و اقتدار اور قانون سازی کا منصب صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو حاصل ہے اور کسی ادارے یا انسان کو حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں۔ حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے۔ جس کی نیابت خدا کے رسولؐ کو ملی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ریاست بہرحال دینی ریاست ہوگی۔ یہ دینی ریاست ساتھ ہی دنیوی ریاست بھی ہے کیونکہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اسلام میں خلیفہ نائب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس امر کا پابند ہے کہ اللہ کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے فرائض بجا لائے۔

اسلام میں مذہبی پیشوائیت تھیاکریسی سے مختلف ہے۔ مذہب یا اس کی پیشوائیت پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ اس میں حسب نسب، قومیت، رنگت کوئی چیز وجہِ امتیاز نہیں اسلام میں فضیلت کا معیار تقویٰ ہے اور جو شخص جس درجہ اس پر پورا اُترتا ہے وہ اسی درجہ اللہ کے قریب ہے۔

اسلامی ریاست کی بنیاد

اسلام میں ریاست کا تصور دو اہم بنیادوں پر ہے:

پہلی بنیاد تو یہ آیت ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔

(ترجمہ) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحبِ اَمر کی۔ پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اُسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لے جاؤ۔

(پارہ ۵، سورت ۴، آیت ۵۹)

آیت سے یہ بات واضح ہے کہ حقیقی اطاعت اللہ اور اُس کے رسولؐ کی ہے یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت بلا شرط ہے۔ لیکن اولی الامر کی فرمانبرداری مشروط ہے کہ اگر کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تو قرآن اور حدیث کی طرف رجوع کرو۔ اولی الامر حکم دینے میں غلطی کر سکتا ہے اور اس کا حکم اللہ اور اُس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اولی الامر کا حکم اللہ اور رسولؐ کے حکم کے خلاف ہو تو اُس کی اطاعت نہیں کرنی ہوگی۔

جو حکم خلافِ شریعت نہ ہو اس میں اولی الامر کی اطاعت ضروری ہے تاکہ ملی اتحاد قائم رہے۔ کیونکہ جب تک سب اپنے آپ کو ایک حکم کے تابع نہیں کرتے اُس وقت تک اتحاد قائم نہیں رہ سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان شخص پر واجب ہے کہ وہ قبول کرے اور فرماں برداری کرے، خواہ ایک بات کو پسند کرے یا نہ اسے ناپسند کرے۔ جب تک کہ اُسے (اللہ اور رسولؐ کی) نافرمانی کا حکم نہیں دیا جاتا لیکن اگر (اللہ اور رسولؐ) کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ قبول کرنا ہے اور نہ اطاعت کرنا ہے۔ اختلاف کی صورت میں فیصلہ کن قول یا کلام اللہ ہے یا حدیثِ نبوی ہے۔

دوسری بنیاد اس آیت پر ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۔

(ترجمہ) اور ان کا کام آپس میں صلاح مشورہ سے ہوتا ہے۔

(پارہ ۲۵ سورت ۴۲ آیت ۳۸)

اس آیت میں فرمانِ الٰہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت مشورہ پر ہونی چاہیئے۔ ایک حدیث میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ کے بعد کوئی اہم امر پیش آئے جس کے متعلق قرآن کوئی نص صریح نہیں نہ آپؐ کا کوئی فیصلہ ہے تو فرمایا کہ میری امت کے نیک لوگوں کو جمع کرو اور مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو اور اکیلے کی رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

خلیفہ کا انتخاب

اسلام میں نامزدگی کی قطعاً گنجائش نہیں، خلیفہ کا انتخاب بذریعہ رائے ہی عمل میں آسکتا ہے۔ حضرت صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اُس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں جمہوری طریقہ سے منتخب کیا گیا اور یہ کہ اُنہیں اس منصب کی کبھی خواہش نہ تھی۔

"خدا کی قسم میں نے کسی دن اور رات میں امارت کی ہوس نہیں کی۔ اور نہ ہی مجھے اس کی کوئی خواہش ہے۔ میں نے کبھی تنہائی یا اعلانیہ طور پر خدا سے بھی امارت کے لیے سوال نہیں کیا۔ لیکن اختلاف بین المسلمین سے ڈر کر میں نے اسے قبول کیا ہے۔ امارت میرے لیے باعث رحمت نہیں بلکہ مجھ پر تو بہت بڑا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔" (اخرجہ الحاکم)

حضرت عمرؓ کا یہ مشہور قول ہے:

لَا خلافۃ اِلَّا عَنِ المشورۃ

مشورہ کے بغیر خلافت (قائم) نہیں ہوسکتی

حضرت علیؓ کو جب امیر معاویہؓ نے ایک خط میں لکھا کہ آپ کو خلیفہ کس نے بنایا ہے تو آپ نے نہایت مدلّل جواب دیا جس میں خلیفہ کے انتخاب کے متعلق تمام ضروری امور کا ذکر ہے:

"حق رائے صرف مہاجرین اور انصار کو حاصل ہے۔ وہ جس شخص پر مطمئن ہو جائیں اور اس کو اپنا امام تسلیم کر لیں تو یہ جمہور کا ناطق فیصلہ مانا جائے گا اگر کوئی شخص طعن یا بدعت کی بنا پر اس فیصلہ کو تسلیم نہ کرے تو اس کو اس کے لیے مجبور کرنا چاہیے۔ اور اگر پھر بھی انکار کرے تو اس سے جنگ کی جائے کیونکہ اس نے سبیل المومنین کو ترک کر دیا ہے۔"

(نہج البلاغہ)

تمام خلفائے راشدین کا انتخاب جمہور کی رائے سے عمل میں آیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب انصار و مہاجرین کی رائے سے ہوا۔ حضرت صدیق نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کا نام خلافت کے لیے تجویز کیا اور اس کا آخری فیصلہ مجلس شوریٰ کے سپرد کر دیا جس نے حضرت ابوبکرؓ کی تجویز سے اتفاق کیا اور حضرت عمرؓ مجلسِ شوریٰ کے ذریعے خلیفہ منتخب ہو گئے۔

حضرت عمرؓ نے وفات سے قبل چھ اشخاص پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ تجویز کی تاکہ اس کی جانشینی کا فیصلہ کرے۔ مقرر کردہ مجلسِ شوریٰ کے ارکان نے باہمی مشورے سے عبدالرحمٰن بن عوف کو اس امر کے فیصلہ کا اختیار دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مدینہ کے پچاس اشخاص مجلسِ شوریٰ کے مشیر مقرر کیے جنہوں نے رائے عامہ معلوم کر کے حضرت عثمانؓ کے انتخاب کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح حضرت علیؓ کا انتخاب بھی انصار و مہاجرین کے ارباب حل وعقد کے ذریعے عمل میں آیا۔

خلافت کا معیار

اسلام ایک پاکیزہ معاشرے کا قیام چاہتا ہے۔ اس لیے خلافت کے لیے امت کے بہترین فرد کا انتخاب ناگزیر ہے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ (پارہ ۲۶ سورۃ ۴۹ آیت ۱۳) حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو ایک جماعت کا امیر بناتا ہے اور اس جماعت میں اس سے بہتر اور پسندیدہ آدمی بھی موجود ہے۔ تو وہ خدا، رسول اور مومنوں سے خیانت کرتا ہے۔ اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معیار خلافت صالح نہیں اصلح ہے۔

نیک نہیں نیک ترین ہے، پسندیدہ نہیں پسندیدہ ترین ہے۔ رئیس مملکت کا کردار معاشرے کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں منعکس ہوتا ہے۔ اگر وہ خود راست باز اور منصف مزاج ہے تو سارے معاشرے میں راست بازی اور منصف مزاجی سرایت کر جائے گی۔ حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا:

"اگر میں جانتا کہ کوئی دوسرا مجھ سے بہتر طور پر امور خلافت کو انجام دینے کی قوت رکھتا ہے تو اس صورت میں خلافت کی ذمہ داری کے مقابلہ میں میرا قتل کیا جانا میرے لئے آسان تر ہوتا۔"

اسلامی ریاست کے رہنما اصول

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر اسلامی ریاست کے وہ رہنما اصول بیان فرمائے ہیں جن پر اسلام پوری زندگی کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً "وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ .... فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا۔"

(سورت بنی اسرائیل آیات ۲۳ - ۳۹)

ان پندرہ آیتوں میں اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم دی گئی ہے۔

ان آیات کی ابتدا توحید الٰہی سے ہوتی ہے جو اخلاقِ مکارم کی جان ہے، جو شخص ہر چیز کے سامنے سر جھکاتا پھرتا ہے، وہ ذلت کا راستہ اختیار کرتا ہے اور جو خدائے واحد کے آگے سر نہیں جھکاتا وہ اخلاقی قوتوں سے محروم ہوتا ہے۔ یہ احساس کہ انسان سے بالاتر سوائے خدا کے کوئی طاقت نہیں۔ انسان کو اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ تسخیر بنا دیتا ہے۔

توحید کے بعد انسان سے حُسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کی طرف توجہ دلائی کیونکہ وہ انسان کی جسمانی ربوبیت (پرورش) کرنے میں سب سے بڑھ کر ہیں اور اولاد کو احسان کی تاکید کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ ان کے ساتھ کمال ادب و احترام سے پیش آیا جائے اور نہایت نرمی سے بات کی جائے بڑھاپے کا زمانہ کمزوری کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں خاص احتیاط کی جائے تاکہ کوئی بات بارِ خاطر نہ ہو۔ احادیث میں ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کی اس قدر

ترغیب دلائی ہے کہ جنت کو ماں کے قدموں کے نیچے قرار دیا ہے، اور ایک حدیث میں ہے کہ والدین کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور اُن کی ناراضگی اس کی ناراضگی ہے۔

ماں باپ کے حقوق کے بعد قریبیوں، محتاجوں اور مسافروں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ ہر انسان کے مال میں اُس کے قریبیوں، محتاجوں اور مسافروں کا بھی کچھ حق ہے۔ مال کے بے جا خرچ سے منع کر کے یہ سمجھایا ہے کہ مال کو صحیح طور پر خرچ کرو، فضول خرچی نہ کرو، خرچ کرنے کے معاملے میں میانہ روی سے کام لو، اور اگر مسکین اور محتاج کو کچھ دینے کی استطاعت نہ ہو تو سختی سے رَد نہ کرو، نرمی سے کلام کرو۔

قبل ازیں کہ آیات میں دوسروں سے نیکی کی تعلیم ہے۔ اب ان کی حق تلفی سے اجتناب کی ہدایت ہے۔ یہ دونوں باتیں دوسروں سے نیکی اور حق تلفی سے پرہیز اخلاق کی تکمیل کرتی ہیں۔ حق تلفی کے زمرے میں قتلِ اولاد، قتلِ نفس، یتیم کا مال اور ایفائے عہد ہیں۔

قتلِ اولاد کے متعلق یہ آیت:

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ۔

(ترجمہ) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے نہ مار ڈالو۔

(پارہ ۱۵ سورت ۱۷ آیت ۳۰)

اور سورۃ الانعام کی یہ آیت:

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ۔

(ترجمہ) اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔

(پارہ ۸ سورت ۶ آیت ۱۵۱)

اکٹھی پڑھی جانی چاہئیں۔

مَلَق کے معنی لطف و مدارات ہیں اور اِملاق سارا مال خرچ کر کے مفلس ہو جانا ہے۔ ایک آیت میں من اِملاق فرمایا یعنی مفلسی کی وجہ سے۔ دوسری جگہ ہے: خشیة املاق یعنی مفلسی کے ڈر سے۔ ہو سکتا ہے دونوں کے ایک معنی ہوں، ہو سکتا ہے پہلے سے مراد وہ ہیں جو مفلس ہیں اور دوسرے وہ جو مفلس نہیں مگر ڈرتے ہیں کہ مفلس نہ ہو جائیں۔

مذکورہ بالا آیات میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کی توجہ دلائی۔ پھر اولاد کے قتل کی طرف۔ اولاد کے قتل سے بعض نے مراد بیج ضائع کرنا لیا ہے اور بعض نے لڑکیوں کو زندہ گاڑنا۔ مگر سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا ہے۔ اکثر لوگ مفلسی کی وجہ سے یا مفلس ہو جانے کے خوف سے اولاد کی تربیت نہیں کرتے تھے۔ پہلے والدین کے حقوق بیان کیے۔ اب اولاد کے حقوق بیان کیے کہ اُن کو اچھی تعلیم و تربیت دی جائے اور فواحش سے روکا جائے اور بدترین فعل زنا ہے جس سے نسلِ انسانی کی افزائش پر بُرا اثر پڑتا ہے، حرامی بچے کوئی نہیں اپناتا، وہ مناسب نگہداشت اور تعلیم و تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی جان کو باعثِ حرمت ٹھہرایا ہے اور وارث یعنی حکومتِ وقت کو تحقیقات کرنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے لیکن حکومت بھی سزا دینے کے معاملے میں حد سے تجاوز کرنے کی مجاز نہیں۔

یتیم کے مال کا لالچ مذموم ہے بلکہ اُس کے مال کی پوری پوری حفاظت کی جائے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے، عہد کی پابندی لازم ہے کیونکہ اس کے بارے میں جوابدہی ہوگی۔ پھر ماپ تول کے متعلق حکم ہے کہ تم جب ماپو تو ماپ کو پورا پورا کرو اور سیدھی ترازو سے تولو۔ قسطاس میزان (ترازو) کو کہتے ہیں۔ چنانچہ میزان سے عدل کرنا یا انصاف کرنا مراد لیا جاتا ہے۔ بالقسطاس المستقیم میں یہ اشارہ ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات میں عدل و انصاف ملحوظ رکھے۔ ہر قسم کی حق تلفی سے منع فرمانے کے بعد ایک اور بات سے بھی منع فرمایا جس سے بڑی بڑی بداخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں یعنی دوسروں کی بدگوئی یا عیب جوئی کرنا۔ نواہی میں ایک اور اہم بات انسان کی متکبرانہ روش ہے جس سے پرہیز لازم ہے۔ متکبر انسان معاشرے میں فساد کا باعث بنتا ہے۔ ان آیات کی ابتدا بھی توحید سے ہوئی تھی اور خاتمہ بھی توحید پر ہو کہ اصل اصول ہے۔

اسلامی اصولوں کا نفاذ

خلفائے راشدین نے اسلامی ریاست کے اصولوں کو بتدریج نافذ کیا، عملی نمونہ پیش کیا اور ثابت کیا کہ یہ اصول ہی نوعِ انسان کی فلاح و نجات کا واحد ذریعہ ہیں

خلیفہ عام حقوق میں سب کے برابر ہے

ان اصولوں میں ایک اہم اصول یہ ہے کہ خلیفۃ المسلمین عام حقوق میں سب کے برابر ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"مجھے تمہارے مال (یعنی بیت المال) میں اس قدر حق ہے جتنا یتیم کے مربی کو اُس کے مال میں۔ اگر میں مالدار ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا، اور اگر ضرورت پڑے گی تو دستور کے مطابق کھانے کے لیے لوں گا۔ صاحبو! مجھ پر آپ لوگوں کے متعدد حقوق ہیں، جن کا آپ کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہیئے، مثلاً:

(۱) ملک کا خراج اور مالِ غنیمت بے جا طور پر نہ جمع کیا جائے۔

(۲) جب میرے ہاتھ میں خراج اور مالِ غنیمت آئے تو بے جا طور پر صرف نہ ہونے پائے۔

(۳) میں تمہارے روزینے بڑھاؤں اور سرحدوں کو محفوظ رکھوں۔

(۴) تم کو خطرے میں نہ ڈالوں۔"

{ابو یوسف : کتاب الخراج۔ ص ۶۷
شبلی : الفاروق صفحات ۲۱۱ - ۲۱۰}

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرِعام لوگ حضرت عمر سے باز پُرس کرتے۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ ہر سال حج کے موقع پر تمام عاملوں کا محاسبہ کیا کرتے تھے۔

سیاستِ مُدن کے اصول

امیرالمومنین حضرت علیؓ نے اپنے ایک حکم نامے میں مصر کا والی مقرر کرتے وقت حکمرانی اور سیاستِ مدن کے اصول بیان فرمائے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد کن فکری، اخلاقی، معاشی اور سیاسی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس حکم نامے کے بعض حصے پیش کیے جاتے ہیں:

"اپنے لیے عمل صالح کا ذخیرہ پسند کیا جائے اور حرام چیزوں سے اجتناب

کیا جائے...... اپنے دل میں رعایا کے لیے رحم اور لطف و محبت پیدا کرے اور چیر پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جائے اپنے عفو و کرم کا دامن خطاکاروں کے لیے اس طرح پھیلائے رکھے، جس طرح اس کی آرزو ہے کہ خدا اس کی خطاؤں کے لیے اپنا دامن عفو و کرم پھیلا دے... یہ بھی یاد رہے کہ وہ رعایا کا نگران ہے، خلیفہ اس کا نگران ہے، اور خدا خلیفہ کے اوپر حاکم ہے۔ حکومت کے نشے اور غرور سے بچنا چاہیے اپنے پرائے سب سے انصاف کیا جائے اور ظلم سے بچا جائے۔ رعایا کا خاص خیال رکھا جائے......... دین کا اصل ستون، مسلمانوں کی اصل جمعیت، دشمن کے معاملے میں اصل طاقت، اُمت کے عوام ہیں۔ چنانچہ عوام ہی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ بغض و کینہ اور عداوت و غیبت کے اسباب کو ختم کر دینا چاہیے اور بخیل و حریص انسانوں کو اپنے مشوروں میں شامل نہ کیا جائے...... نیک اور دیانت دار وزیر مقرر کیے جائیں....... نیک و بد کو برابر نہ سمجھا جائے۔ ایسا کرنے سے نیکوں کی ہمت پست ہو جائے گی اور خطاکار اور بھی شوخ ہو جائیں گے .... رعایا کو رحم و کرم کر کے اُس کا حسنِ ظن حاصل کرنا چاہیے......

رعایا میں کئی طبقے ہوتے ہیں۔ یہ طبقے ایک دوسرے سے وابستہ رہتے ہیں اور آپس میں کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ایک طبقہ وہ ہے جسے خدا کی فوج کہنا چاہیے...... یہ رعایا کا قلعہ ہے، حاکم کی زینت ہے، دین کی قوت ہے، امن کی ضمانت ہے۔ رعایا کا قیام فوج ہی سے ہے لیکن فوج کا قیام خراج سے ہے۔ خراج ہی سے سپاہی جہاد میں تقویت پاتے ہیں اور اپنی حالت درست کرتے ہیں۔ پھر ان دونوں طبقوں (فوج اور اہلِ خراج) کی بقا کے لیے ایک تیسرا طبقہ ضروری ہے۔ یعنی قضاۃ، عمّال اور کتّاب کا طبقہ اور ان طبقوں کی بقا کے لیے تاجر اور اہلِ حرفہ ضروری ہیں۔ آخر میں حاجت مندوں اور مسکینوں کا طبقہ آتا ہے اور اس طبقے کی

امداد و اعانت ازبس ضروری ہے ۔ خدا کے یہاں سب کے لیے گنجائش ہے اور حاکم پر سب کا حق قائم ہے ۔۔۔۔۔۔

فوج کے لیے ایسے پاک دل اور بے داغ لوگوں کو منتخب کرنا چاہیئے جو ہمت و شجاعت اور جود و سخا سے آراستہ ہوں۔ ان کے معاملات میں ویسی ہی فکر کرنی چاہیئے جیسی کہ والدین کو اولاد کی ہوتی ہے ۔۔۔۔

حاکم کی آنکھ کی ٹھنڈک ملک میں انصاف قائم کرنے میں ہے ۔ عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے ایسے لوگ منتخب کیے جائیں جو نہ تنگ نظر اور تنگ دل ہوں اور نہ حریص و خوشامد پسند ۔۔۔۔۔۔

مشکل اور مشتبہ حالات میں قرآن اور سنت سے راہنمائی حاصل کی جائے عمال کا تقرر بھی پوری جانچ پڑتال کے بعد کیا جائے ۔ عہدے داروں کو بہت اچھی تنخواہیں دی جائیں تاکہ یہ لوگ مالی پریشانیوں سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض انجام دے سکیں ۔۔۔۔۔۔

محکمہ خراج کی اہمیت کے پیش نظر اس کی پوری نگرانی کی جائے لیکن خراج سے زیادہ زمینوں کی آبادکاری پر توجہ دینی چاہیئے کیونکہ خراج کا انحصار تو اسی بات پر ہے جو حاکم زرعی ترقی کے بغیر خراج چاہتا ہے اس کی حکومت چند روزہ ثابت ہوگی ۔۔۔۔۔۔

اگر کاشت کار خراج کی زیادتی یا کسی آسمانی آفت یا آب پاشی میں خرابی آجانے یا سیلاب یا خشک سالی کی شکایت کریں تو خراج کم کر دینا ضروری ہے کیونکہ کاشت کار ہی اصل خزانہ ہیں ۔۔۔۔

ملک میں آبادی اور شادابی ہر بوجھ اٹھا سکتی ہے لہٰذا اس کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے ۔ ملک کی بربادی تو باشندوں کی غربت ہی سے ہوتی ہے اور باشندوں کی غربت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ حاکم دولت سمیٹنے پر کمر باندھ لیتے ہیں ۔۔۔۔۔

ہر علاقے کی کڑی نگرانی بھی ضروری ہے ۔۔۔۔۔۔ ذخیرہ اندوزی کی قطعی ممانعت کر دینی چاہیئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے

منع فرمایا ہے...... ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو اعتدال کے ساتھ عبرت ناک سزا دی جائے....... پھر فقیر، مسکین، محتاج، قلّاش، اپاہج ایسے بے سہارا انسانوں کے بارے میں جو فرض خدا نے عائد کیا ہے اس پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ بیت المال میں ایک حصہ اُن کے لیے خاص کر دیا جائے......

اپنے وقت کا ایک حصہ فریادیوں کے لیے مخصوص کرنا ضروری ہوتا ہے خاص مراسلوں کا جواب خود لکھنا چاہیئے۔ سرکاری آمدنی میں مستحق لوگوں کا حصہ فوراً ادا کرنا چاہیئے اور کام روز کا روز ختم ہونا چاہیئے..... اگر رعایا کو کبھی حاکم پر شبہ ہو جائے تو بے دھڑک رعایا کے سامنے آکر اُس کا شبہ دُور کرنا بھی ضروری ہے۔"

(نہج البلاغہ)

اسلام میں حرّیت، اخوّت اور مساوات

حریت، اخوت اور مساوات کا تصور اسلام کی عطا ہے۔ خلفائے راشدین نے اپنے قول و فعل سے ان قدروں کو پروان چڑھایا اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ اسلام ان عظیم قدروں کا بانی و محافظ ہے۔

نظامِ اسلام میں اپنے بیگانے سب برابر تھے اور امّت کے حقوق پر دست اندازی کی کسی کو جرأت نہ تھی۔ حضرت علیؓ کو اپنے ایک عہدے دار کے متعلق جو آپ کا قریبی رشتہ دار بھی تھا شکایت موصول ہوئی کہ اس نے بیت المال میں خیانت کی ہے۔ آپ نے اسے تحریر فرمایا:

"اے وہ شخص جسے ہم عقل مند سمجھا کرتے تھے، تیرے جی کو کھانا پینا کیسے لگتا ہے جب کہ تو جانتا ہے کہ حرام کھا رہا ہے، حرام پی رہا ہے۔ تو کنیزیں خریدتا ہے، عورتوں سے نکاح کرتا ہے، مگر کس مال سے؟ یتیموں، مسکینوں، مومنوں اور مجاہدوں کے مال سے! اس مال سے جو خدا نے مومنوں اور

مجاہدوں کو غنیمت میں دیا تھا اور جس سے اس ملک کی حفاظت کرنی مقصود تھی۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ اب تو خدا سے ڈرے اور اُمّت کو اُس کا مال لوٹا دے۔ اگر تو یہ نہیں کرے گا اور خدا تجھے میرے قبضے میں کر دے گا تو تیرے بارے میں خدا کے سامنے میرا عذر پورا ہو کر رہے گا اور میں اپنی تلوار تجھے مار کر جہنم رسید کر دوں گا۔ قسم خدا کی اگر حسنؓ اور حسینؓ بھی وہ کرتے جو تو نے کیا ہے تو ہرگز مجھ سے رعایت نہ پاتے اور کسی طرح کی نرمی نہ دیکھتے یہاں تک کہ میں خدا کا حق اُن سے اُگلوا لیتا اور اُن کے ظلم سے پیدا ہونے والے باطل کو مٹا دیتا۔" (نہج البلاغہ)

ایک موقع پر ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو مخاطب کر کے کہا:

"اِتَّقِ اللہ یا عُمَرَ (یعنی اے عمر اللہ سے ڈر) حاضرین میں سے ایک شخص نے اُس کو روکا اور کہا کہ بس بہت ہوا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "نہیں کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں تو یہ بے مصرف اور ہم لوگ نہ مانیں تو ہم۔" (شبلیؒ: الفاروق ص ۲۱۱)

حضرت صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو مشہور خطبہ ارشاد فرمایا اس کا ایک ایک لفظ آزادی رائے اور حریتِ فکر کی ضمانت ہے:

"اے لوگو! مجھے تمہارا ولی بنایا گیا ہے، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں اے لوگو! میں کتاب و سنت کی پیروی کرنے والا ہوں اور اپنی طرف سے کوئی نئی بات دین میں پیدا کرنے والا نہیں۔ اگر میں ٹھیک ٹھیک چلوں تو میری مدد کرو اور اگر غلط راستہ پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔"

شبلیؒ لکھتے ہیں:

"عدل و انصاف کا ایک بڑا لازمہ عام مساوات کا لحاظ ہے۔ یعنی دیوانِ عدالت میں شاہ و گدا، امیر و غریب، شریف و رذیل سب ہم مرتبہ سمجھے جائیں حضرت عمرؓ کو اس کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس کے تجربے اور امتحان کے لیے متعدد دفعہ خود عدالت میں فریق مقدمہ بن کر گئے۔ ایک دفعہ ان میں اور

ابی بن کعب میں کچھ نزاع تھی - ابی نے زید بن ثابت کے ہاں مقدمہ دائر کر دیا - حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے - زید نے تعظیم دی - حضرت عمرؓ نے فرمایا :

" یہ تمہارا پہلا ظلم ہے "

یہ کہہ کر اُبی کے برابر بیٹھ گئے - زید کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور حضرت عمرؓ کو دعوے سے انکار تھا - اُبی نے قاعدے کے مطابق حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہی لیکن زید نے ان کے رتبے کا پاس کر کے اُبی سے درخواست کی کہ امیر المومنین کو قسم سے معاف رکھو - حضرت عمرؓ اس طرفداری پر نہایت رنجیدہ ہوئے - زید کی طرف مخاطب ہو کر کہا :

" جب تک تمہارے نزدیک ایک آدمی اور عمر دونوں برابر نہ ہوں تم منصبِ قضاۃ کے قابل نہیں سمجھے جا سکتے "

(شبلی : الفاروق صفحات ۲۶۶، ۲۶۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے الوداعی خطبے میں اعلان کیا تھا :

" اے لوگو ! مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں ، کسی شخص کے لیے اس کے بھائی کا مال لینا ، اُس کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے - آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی - اے اللہ ! تو خود بھی گواہ رہو ! سو میرے بعد کہیں (اس اخوت کو ترک کر کے) پھر کافرانہ ڈھنگ اختیار کر کے ایک دوسرے کی گردنیں نہ کاٹنے لگنا "

اخوت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ :

" تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی رہیں "

اسلام میں جمہوریت

ظہورِ اسلام کے وقت کہیں جمہوری سلطنت قائم نہ تھی - ایران پر ہمیشہ بادشاہت مسلط رہی ہے - روم میں بھی کبھی جمہوریت کے آثار ملتے تھے - وہاں بھی شخصی حکومت قائم

ہو چکی تھی، اسلام نے بغیر کسی مثال اور نمونے کے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی۔ شبلیؒ لکھتے ہیں :

مجلسِ شوریٰ

"ان سب کے اصل الاصول مجلسِ شوریٰ کا انعقاد تھا یعنی جب کوئی انتظام پیش آتا تھا تو ہمیشہ اربابِ شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی۔ اور کوئی امیر بغیر مشورہ اور کثرتِ رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ جماعت اسلام میں اس وقت دو گروہ تھے جو کل قوم کے پیشوا تھے اور جن کو تمام عرب نے گویا اپنا قائم مقام تسلیم کر لیا تھا۔ یعنی مہاجر و انصار۔

مجلسِ شوریٰ کے ارکان اور ان کے انعقاد کا طریقہ

مجلسِ شوریٰ میں ہمیشہ لازمی طور پر ان دونوں گروہ کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ انصار بھی دو قبیلوں میں منقسم تھے : اوس اور خزرج۔ چنانچہ ان دونوں خاندانوں کا مجلسِ شوریٰ میں شریک ہونا ضروری تھا . . . . . .
مجلس کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا تھا، کہ الصّلوٰۃ جامعہ یعنی سب لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے تھے اور بحث طلب امر پیش کیا جاتا تھا۔

مجلسِ شوریٰ کے جلسے

معمول اور روزمرہ کے کاروبار میں مجلس کے فیصلے کافی سمجھے جاتے تھے۔ لیکن جب کوئی امرِ اہم پیش آتا تھا تو مہاجرین و انصار کا اجلاس عام ہوتا تھا اور سب کے اتفاق سے وہ امر طے پاتا تھا۔

ایک اور مجلس

مجلسِ شوریٰ کا اجلاس خاص خاص ضرورتوں کے پیش آنے کے وقت ہوتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک مجلس تھی جہاں روزانہ انتظامات اور ضروریات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ مجلس ہمیشہ مسجد نبویؐ میں منعقد ہوتی تھی اور صرف مہاجرین صحابہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ صوبجات اور اضلاع کی روزانہ خبریں جو دربارِ خلافت میں پہنچتی تھیں حضرت عمرؓ ان کو مجلسِ شوریٰ میں بیان کرتے تھے اور کوئی بحث طلب امر ہوتا تھا تو اُس میں لوگوں سے استصواب کیا جاتا تھا۔

عام رعایا کی مداخلت

مجلسِ شوریٰ کے ارکان کے علاوہ تمام رعایا کو انتظامی امور میں مداخلت حاصل ہوتی تھی۔ صوبہ جات اور اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کیے جاتے تھے بلکہ بعض اوقات بالکل انتخاب کا طریقہ عمل میں آتا تھا۔ کوفہ، بصرہ اور شام میں جب عمّالِ خراج مقرر کیے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند سے ایک ایک شخص انتخاب کر کے بھیجیں۔ جو ان کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانتدار اور قابل ہو ۔ ۔ ۔ ۔"

(شبلیؒ: الفاروق، صفحات ۲۰۸، ۲۰۷)

اسلام نے جس جمہوریت کی بنیاد رکھی اُس میں ہر فرد کاروبارِ حکومت میں برابر کا شریک تھا اور ہر ایک کو خلیفہ اور دوسرے عمّال کی باز پرس کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ لوگ بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کرتے اور اپنی شکایات حکام تک پہنچاتے اور کسی کو کسی پر زیادتی کی ہمت نہ ہوتی۔

اسلام اور غیر مسلم رعایا

اسلامی ریاست میں مقیم غیر مسلم رعایا کو ذمّی کہا جاتا ہے۔ اسلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نفسِ انسانیت کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ چنانچہ انسانی حقوق کے معاملے میں مسلم اور غیر مسلم میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے ذمیّوں کی ہر طرح کی مذہبی، اقتصادی، معاشی اور فکری آزادی عطا کی ہے اور عام انسانی حقوق میں ان کو مسلمانوں کے برابر قرار دیا ہے۔

ذمیّوں سے حقوق کی نگرانی کے بدلہ میں اُن سے برائے نام رقم وصول کی جاتی تھی، جس کو جزیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسلام کے مخالفین نے جزیہ کے لفظ کو بہت اُچھالا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ذمیّوں سے جزیہ کی حقیر رقم کے مقابلہ میں مسلمانوں سے زکوٰۃ، عشر اور دوسرے صدقات کے طور پر جو رقم وصول کی جاتی تھی وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہوتی تھی۔

مسلمانوں نے اس حقیر رقم کے مقابلے میں غیر مسلم رعایا کے حقوق اور جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے آنے والے خلیفہ کو ان الفاظ میں وصیّت کی:

> "میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو ذمیّوں کے معاملے میں وصیّت کرتا ہوں کہ ان کے عہد کو پورا کیا جائے اور ان کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے اور اُن کی طاقت سے زیادہ اُن پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔"
> (کتاب الخراج)

اسلامی انصاف نے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک نظر سے دیکھا ہے اور مسلمان فریق کی کبھی رعایت نہیں کی بلکہ بے شمار واقعات ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم کے حق میں فیصلہ دیا گیا۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ کھو گئی اور ایک نصرانی کے ہاتھ لگ گئی کچھ دنوں بعد حضرت علیؓ نے وہ زرہ اس نصرانی کے پاس دیکھ کر پہچان لی اور قاضی شُریح کی عدالت میں دعوےٰ کیا۔ نصرانی نے بیان دیا کہ زرہ میری ہے۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے پوچھا: کیا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟ انہوں نے فرمایا: "نہیں" قاضی

شریح نے اس نصرانی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ نصرانی پر اس فیصلے کا اتنا اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہوگیا اور کہا:

"یہ تو انبیاء جیسا انصاف ہے کہ خلیفۂ وقت مجھے اپنے ماتحت شہری کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی خلیفہ کے خلاف فیصلہ دیتا ہے۔"

غیر مسلموں کے ساتھ مراعات کی ایک عجیب مثال

متعدد مورخین نے ذمیوں کے ساتھ فقید المثال حسن سلوک کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے مسلمانوں کی انسانیت دوستی اور انصاف پسندی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

"رومی جو شکست کھا کر دمشق و حمص وغیرہ سے نکلے تھے انطاکیہ پہنچے، ہرقل سے فریاد کی کہ عرب نے تمام شام کو پامال کر دیا ہے۔ ہرقل نے ان میں سے چند ہوشیار اور معتبر آدمیوں کو دربار میں طلب کیا کہ عرب تم سے زور میں، جمعیت میں اسر و سامان میں کم ہیں پھر تم اُن کے مقابلے میں کیوں نہیں ٹھہر سکتے۔ اس پر سب نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن ایک تجربہ کار بڈھے نے عرض کیا کہ عرب کے مذاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں وہ رات کو عبادت کرتے ہیں اور دن کو روزے رکھتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، آپس میں ایک سے ایک برابری کے ساتھ ملتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پیتے ہیں، بدکار ہیں، اقرار کی پابندی نہیں کرتے، اوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے اور ہمارا جو کام ہوتا ہے، ہمت اور استقلال سے خالی ہوتا ہے۔"

قیصر درحقیقت شام سے نکل جانے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن ہر شہر اور ہر ضلع سے جوق در جوق عیسائی فریادی چلے آتے تھے، قیصر کو سخت غیرت آئی اور نہایت جوش کے ساتھ آمادہ ہوا کہ شہنشاہی کا پورا زور عرب کے مقابلے میں صرف کر دیا جائے۔ روم قسطنطنیہ اور آرمینیہ ہر جگہ احکام بھیجے کہ تمام فوجیں پائے تخت انطاکیہ میں ایک تاریخ معین تک حاضر ہو جائیں۔ تمام اضلاع کے افسروں کو لکھ بھیجا کہ جس قدر آدمی جہاں سے مہیا ہو سکیں روانہ کیے جائیں۔ ان احکام کا پہنچنا تھا کہ فوجوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ انطاکیہ کے چاروں طرف جہاں

تک نگاہ جاتی تھی فوجوں کا ٹڈی دل پھیلا ہوا تھا۔

حضرت ابو عبیدہ نے جو مقامات فتح کر لیے تھے، وہاں کے اُمراء اور رئیس ان کے عدل و انصاف سے اس قدر گرویدہ ہو گئے تھے کہ باوجود تخالفِ مذہب کے خود اپنی طرف سے دشمن کی خبر لانے کے لیے جاسوس مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ ان کے ذریعے سے حضرت ابو عبیدہؓ کو تمام واقعات کی اطلاع ہوئی، جنہوں نے تمام افسروں کو جمع کیا۔ اور کھڑے ہو کر پُر اثر تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:

"اے مسلمانو! خدا نے تم کو بار بار جانچا اور تم اس کی جانچ پر پورے اترے، چنانچہ اس کے صلہ میں خدا نے ہمیشہ تم کو مظفر و منصور رکھا۔ تمہارا دشمن اس سرو سامان سے تمہارے مقابلے کے لیے چلا آ رہا ہے کہ زمین کانپ اٹھی ہے، اب بتاؤ کیا صلاح ہے؟"

یزید بن سفیان (معاویہؓ کے بھائی) کھڑے ہوئے اور کہا:

"میری رائے ہے کہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں رہنے دیں اور ہم خود شہر کے باہر لشکر آرا ہوں۔ اس خط کے ساتھ خالد اور عمرو ابن العاص کو خط لکھا جائے کہ دمشق اور فلسطین سے چل کر مدد کو آئیں۔ شرجیل بن حسنہ نے کہا کہ اس موقع پر ہر شخص کو آزادانہ رائے دینی چاہیئے۔ یزید نے جو رائے دی ہے بلاشبہ خیر خواہی سے دی ہے لیکن میں اس کا مخالف ہوں۔ شہر والے تمام عیسائی ہیں۔ ممکن ہے وہ تعصب سے ہمارے اہل و عیال کو پکڑ کر قیصر کے حوالے کر دیں یا خود مار ڈالیں۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا اس کی تدبیر یہ ہے کہ ہم عیسائیوں کو شہر سے نکال دیں۔"

شرجیل نے اُٹھ کر کہا:

"اے امیر! تجھ کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہم نے ان عیسائیوں کو اس شرط پر امن دیا ہے کہ وہ شہر میں اطمینان سے رہیں۔ اس لیے نقضِ عہد کیونکر ہو سکتا ہے؟"

حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنی غلطی تسلیم کر لی لیکن یہ بحث طے نہیں ہوئی کہ آخر کیا کیا

جائے؟ عام حاضرین نے رائے دی کہ حمص میں ٹھہر کر امدادی فوج کا انتظار کیا جائے
ابو عبیدہؓ نے کہا:
"اتنا وقت کہاں ہے"
آخر یہ رائے ٹھہری کہ حمص چھوڑ کر دمشق روانہ ہوں، وہاں خالد موجود ہیں اور عرب کی سرحد قریب ہے۔ جب یہ ارادہ مصمّم ہو چکا تو ابو عبیدہؓ نے حبیب بن مسلم کو جو افسر خزانہ تھا بلا کر کہا کہ عیسائیوں سے جو جزیہ یا خراج لیا جاتا ہے، اس معاوضہ میں لیا جاتا ہے کہ ہم ان کو اُن کے دشمنوں سے بچا سکیں۔ لیکن اس وقت ہماری حالت ایسی نازک ہے کہ ہم اُن کی حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے اس لیے جو کچھ ان سے وصول ہوا ہے سب ان کو واپس دے دو اور اُن سے کہہ دو کہ ہم کو تمہارے ساتھ تعلق اب بھی ہے لیکن چونکہ ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے اس لیے جزیہ جو حفاظت کا معاوضہ ہے۔ تم کو واپس کیا جاتا ہے۔"

چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول ہوئی تھی کل واپس کر دی گئی۔ عیسائیوں پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے "خدا تم کو واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے کہا توراۃ کی قسم ہے جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔"

ابو عبیدہؓ نے صرف حمص والوں کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا بلکہ جس قدر اضلاع فتح ہو چکے تھے ہر جگہ لکھ بھیجا کہ جزیہ کی جس قدر رقم وصول ہوئی ہے واپس کر دی جائے۔"

[ان واقعات کو بلاذری نے فتوح البلدان صفحہ ۱۳۷
اور واقدی نے کتاب الخزرج صفحہ ۱۸۱
قاضی ابو یوسف نے فتوح الشام صفحہ ۱۳۸
میں تفصیل لکھا ہے۔
شبلی الفاروق صفحات: ۲۰۹-۲۱۰]

ذمی کاشت کاروں کے ساتھ سلوک

اسلام عدل و مساوات کا دین ہے۔ اس نے تعلقات کے ہر شعبہ میں قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا ہے۔ ذمی کاشت کاروں کے متعلق بھی اسلام کا رویّہ بڑا فیاضانہ تھا حضرت علیؓ نے عکبرا کے عامل کو نصیحت کی:

"جب تم ان (ذمی کاشت کاروں) کے پاس پہنچو تو خراج وصول کرنے میں نہ تو اُن کے سردی اور گرمی کے لباس کو فروخت کرنا اور نہ اُن کے روزانہ کھانے کی اشیاء کو اور اُن کے جانوروں کو جن سے وہ کاشت کرتے ہیں اور نہ خانہ داری کے ضروری سامان سے کوئی شے خراج میں فروخت کرنا، بیشک ان کو عفو سے فیض یاب کرو۔ اگر تم نے میرے حکم کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ تم سے مواخذہ کرے گا۔ اور اگر مجھے اطلاع ملی کہ تو نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو تجھے معزول کر دوں گا۔"

غیر مسلم اور اسلام کی تبلیغ

اسلامی تصورِ ریاست میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی پوری آزادی ہے اور شہریت کے تمام حقوق حاصل ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی ہدایت بڑی واضح ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔

(ترجمہ) دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں۔ ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

(پارہ ۳ - سورت ۲ آیت ۲۵۶)

اکراہ۔ انسان سے ایسا بوجھ اٹھوانا ہے جسے وہ پسند کرتا ہو۔ اس آیت میں یہ اصول بتایا کہ ایک دین سے دوسرے دین میں داخل ہونا اپنی خوشی کی بات ہے۔ جبر اس میں جائز نہیں کیونکہ ہدایت کی راہ واضح ہو چکی ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ قبیلہ بنی سالم بن عوف میں سے ایک شخص کے دو بیٹے عیسائی تھے۔ جب وہ مسلمان ہوا تو آنحضرتؐ

سے فرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میں اُنہیں اسلام میں داخل کرنے کے لیے مجبور نہ کروں؟
تب یہ آیت نازل ہوئی۔ قرآن مجید اپنے ماننے والوں سے بھی بجبر کچھ نہیں منواتا۔
حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام ہی واحد مذہب ہے جو جبر کا استیصال کرتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ امام مالکؒ نے فتوے دیا کہ جبراً اسلام میں داخل کرنا
غیر اسلامی ہے۔ جعفر بن سلیمان، جو اُس وقت مدینہ کا گورنر تھا، یہ بات ناگوار گذری
چنانچہ امام مالک کو اس پاداش میں کوڑوں سے زدوکوب کیا گیا۔

اسلام اور بین الاقوامی معاہدات

اسلام میں ایفائے عہد کی واضح ہدایت ہے۔ چنانچہ معاہدے کی پابندی مسلمان کا
دینی فریضہ ہے۔

آج کی دنیا میں بین الاقوامی معاہدات کا جو حشر ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں
اقوامِ عالم کے نزدیک معاہدہ کمزوریوں اور مجبوریوں کی پیداوار ہے۔ چنانچہ جونہی
حالات نے پلٹا کھایا معاہدے کے پرخچے اُڑ گئے۔ اسلامی نظریہ سیاست کی بنیاد
اخلاق و روحانیات پر ہے اس لیے اسلامی ریاست ایفائے عہد کی پابند ہے۔ البتہ
اگر دوسری طرف نقضِ عہد ہو تو اس صورت میں معاہدہ کی پابندی لازمی نہیں رہتی۔

اسلام کا معاشی نظام

سوائے اسلام کے ہر نظام تمدن زندگی کے صرف ایک پہلو پر زور دیتا ہے۔
اور باقی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے، جس سے افراط و تفریط کی خرابیاں پیدا
ہو گئی ہیں۔ اسلام کا معاشی نظام الٰہیاتی تصورات کی بنیادوں پر قائم ہونے کے
باعث انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہ ایک متوازن و ہمہ گیر نظام ہے جو ایک
طرف افراط سے بچاتا ہے اور دوسری طرف تفریط سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسلامی نظامِ
معیشت توسط و اعتدال اور عدل و مساوات کی واحد راہ ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت

اس وقت دنیا میں دو نظام رائج ہیں : سرمایہ داری اور اشتراکیت ۔ سرمایہ داری یہ ہے کہ ہر فرد اپنی کوشش اور محنت سے جس قدر مال حاصل کر لے اور سب اس کا ہے ۔ اس خیال کی بدولت حد درجہ کی خود غرضی بڑھ گئی ہے اور دولت عوام کے ہاتھ سے نکل کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہو گئی ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نسلِ انسانی کا بیشتر حصہ دو وقت کی روٹی کا محتاج ہے ۔ سرمایہ داری سے انتقام لینے کے لیے اشتراکیت وجود میں آئی ۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کا حال چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان کی زبانی سنیے :

"پاکستان میں اس وقت جو نظام رائج ہے وہ سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کی برائیوں کو جمع کیے ہوئے ہے ۔ اس نظام نے دو اہم معاشی مسائل کو جنم دیا ہے :

۱ ۔ افلاس ، اور

۲ ۔ دولت کی ناہموار تقسیم

اشتراکیت ان دونوں مسائل کا جو حل پیش کرتی ہے وہ یہ ہے کہ شدید طبقاتی جنگ برپا کر کے مزدوروں کی بہبود کے نام پر آمریت قائم کی جائے اور تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دے کر اس کو آمریت کے حوالے کر دیئے جائیں ۔ کمیونسٹوں کے نزدیک یہ بات ناممکن ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم جمہوری نظام حکومت کی معرفت سے ہو سکے ۔ چنانچہ روس اور چین میں جو کمیونسٹ انقلاب آیا وہ تشدد کے ذریعے سے آیا اور وہاں جو حکومت قائم ہے وہ اگرچہ عوام کے نام پر ہے لیکن عوام کو یا مزدور طبقہ کو اس کے رد و بدل میں قطعاً کوئی اختیار نہیں ۔

سرمایہ داری نظام پر کمیونسٹوں کا یہ اعتراض کہ اس میں دولت اور سیاسی قوت کا ارتکاز ہے کافی حد تک اپنے اندر صداقت رکھتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس مرض یعنی ارتکازِ دولت و سیاست کا جو علاج کمیونسٹ

بتاتے ہیں وہ اس مرض کی شدید ترین شکل ہے یعنی سارا سیاسی اور اقتصادی اقتدار ایک آمریت کے سپرد کر دیا جائے۔ جو نام کو تو مزدوروں کی آمریت ہے لیکن در حقیقت چند افراد کا مجموعہ ہے۔ سرمایہ دار تو پھر بھی ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور اُن کی گرفت بھی اتنی مکمل نہیں لیکن یہ تو دس بیس یا زیادہ سے زیادہ چند سو اشخاص ہیں جن کے ہاتھ دولت کے سرچشمے، معیشت کے تمام ذرائع اور اقتدار کی تمام کنجیاں ہیں۔ ہر فرد بشر کا روزگار، اُس کا کام کاج، اُس کی جائے سکونت، بلکہ اس کا جینا اور مرنا جابر حکمرانوں کی مرضی پر ہے۔ چونکہ سارا پریس اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع ان کے پاس ہیں اس لیے ان سے اختلافات کا کوئی ذریعہ نہیں، تعلیم و تربیت کے تمام اداروں پر قابض ہیں۔ اس لیے یہ انسانوں کے ضمیر کے مالک بھی ہیں اگر کمیونسٹ ڈکٹیٹر چاہے تو لاکھوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے جیسا کہ اسٹالن نے کیا اور کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

استبداد، ظلم اور فساد آمریت کی فطرت میں ہے۔ الغرض بنی نوع انسان کے دُکھوں کا مداوا نہ سرمایہ داری میں ہے اور نہ اشتراکی آمریت میں مغربی سرمایہ داری، شخصی آزادی اور انفرادی حقوق کی آڑ میں قومی زندگی میں انارکی پیدا کرتی ہے اور طاقتوروں کو کھلی چھٹی دیتی ہے کہ وہ کمزوروں کا شکار کریں۔ دوسری طرف کمیونزم اجتماعی زندگی کو مربوط کرنے کی خاطر ساری آبادی کو ایسی جکڑ بندیوں میں کس دیتا ہے کہ انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ دونوں جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اسلام میں انفرادیت اور اجتماعیت کا صحیح اور فطری علاج ہے جو انسانی معاشرے کو افراط اور تفریط سے بچاتا ہے۔ اسلام میں جہاں ایک طرف انسانی شخصیت کا پورا پورا احترام ہے اور اس کے اعمال کی پوری ذمہ داری فرد پر عائد ہوتی ہے، وہاں دوسری طرف معاشرے کے اجتماعی حقوق کا اتنا لحاظ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے کوشاں رہنا فرض ہے اور اجتماعی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی ممنوع ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سیاسی ظلم واستبداد اور معاشی استحصال کا ذریعہ ہیں۔ اشتراکیت جو سرمایہ داری کی پیدا کردہ ناہمواریوں کے خاتمے کے لیے وجود میں آئی تھی، خود سب سے بڑی سرمایہ دار بن گئی۔ ایسی سرمایہ داری جس نے انفرادی ملکیت ختم کر کے سب وسائل معیشت و طاقت اپنے ہاتھ میں مجتمع کر کے ہر فرد بشر کو بے دست و پا کر دیا۔

اسلام کے معاشی نظام کے عناصر ترکیبی

(ا) انفرادی ملکیت کا حق

اسلام ذاتی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے کیونکہ اگر یہ حق انسان سے چھین لیا جائے تو اس میں سعی و کوشش کی خواہش نہیں رہتی۔ ملکیت کی خواہش فطری ہے اور ذوقِ عمل کی خالق ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ہ وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی۔

(ترجمہ) اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں، مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے اور کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

(پارہ ۲۷ سورت ۵۳ آیت ۳۹)

کاروبارِ حیات کا دارومدار اسی اصولِ سعی پر ہے۔ دنیا و آخرت کی سعادتیں کوشش کا ثمرہ ہیں۔ ہوا، پانی اللہ کے خاص انعامات ہیں، لیکن ان ہواؤں اور پانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی زیادہ سے زیادہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جدوجہد کے بغیر نہ دنیا سنورتی ہے اور نہ آخرت۔

(ب) انفاق فی سبیل اللہ

قرآنِ پاک کی رُو سے دولت جمع کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اس سے مقصود ضروریاتِ زندگی کی تکمیل ہے۔ ضروریات پورا کرنے کے بعد اگر کچھ بچ جائے تو اس کو

بنک میں جمع کرنے یا چھپا رکھنے کی بجائے حاجت مندوں میں تقسیم کرنا لازمی ہے۔ قرآن پاک بار بار انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتا ہے اور زکوٰۃ وصدقات کی تلقین کرتا ہے۔ اس باب میں قرآن مجید میں متعدد آیات ہیں۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔

(ترجمہ) اور اُس سے جو ہم نے دیا خرچ کرتے ہیں۔

(پارہ ۱ سورت ۲ آیت ۳)

رزق کا لفظ کبھی عطائے جاریہ پر استعمال ہوتا ہے، کبھی حصہ پر، کبھی غذا پر اس لیے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ میں نہ صرف مال داخل ہے بلکہ تمام ذہنی اور جسمانی قوتیں۔ اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنی تمام طاقتوں کو، مال کو اور علم کو خدا کی راہ یعنی مخلوق کی بھلائی کے لیے لگا دے، کیونکہ تکمیل نفسِ انسانی کے دو پہلو ہیں: خدا کے حضور جھکنا اور مخلوقِ خدا کی خدمت۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۔

(ترجمہ) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہو اور نہ کوئی دوستی ہو اور نہ کوئی سفارش ہو۔

(پارہ ۳ سورت ۲ آیت ۲۵۴)۔

تین چیزیں تجارت، تعلقات، محبت اور سفارش انسان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی ہیں۔ انسان زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے آخری پیسہ تک کاروبار میں لگا دیتا ہے۔ بیوی، بچوں اور عزیزوں پر صرف کرتا ہے اور بڑے لوگوں کی دعوتوں اور ضیافتوں پر لٹاتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں قیامت کے دن کام نہ آئیں گی اُس دن تو اللہ کی راہ میں دیا ہوا کام آئے گا۔

اکتناز اور احتکار کی ممانعت

اکتناز کے معنی ہیں سونے چاندی کے خزانے جمع کرنا اور احتکار کے معنی ہیں

اجناس خوردنی کو نرخ کی گرانی کے انتظار میں روک رکھنا۔ اگر حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کر دیئے گئے ہیں اور سونا چاندی جائز و حلال طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے تو اکتناز مستحق نہیں ہوتا۔ بصورت دیگر اس کی سزا دردناک عذاب ہے۔

اسلام نے احتکار کی شدت سے ممانعت کی ہے۔ اسلام ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری اور چور بازاری کو سرمایہ داری کے عناصر ترکیبی قرار دیتا ہے اور ان کا استیصال کرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

(ترجمہ: اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔

(پارہ ۱۰ سورت ۹ آیت ۳۴)

حضرت ابوذرؓ اس بارہ میں یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک سونے چاندی کا گھر میں رکھنا ہی منع تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال درست نہیں۔ اس لیے کہ پھر زکوٰۃ کس چیز پر ہے اور وراثت کی تقسیم کا کیا مطلب ہے۔ خود حضرت محمد صلعم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مال کو پاک کرنے کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ پس مال کی محبت اس صورت میں بری ہے جب انسان اللہ کی راہ میں کچھ صرف نہ کرے یا مساکین کا حق ادا نہ کرے۔ اسلام کی تعلیم میانہ روی کی ہے۔ مال سے زکوٰۃ اور سرکار کا حصہ ادا کرتے رہو تو مال جمع کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ قابل مذمت وہ لوگ ہیں جو مال جمع کرتے ہیں پھر اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

(د) اسلام وسائل معیشت پر کسی کی ملکیت کا حق تسلیم نہیں کرتا

سرمایہ دار ملکوں میں سرمایہ دار اور اشتراکی ملکوں میں ریاست کے نام پر چند سوشلسٹ لیڈر ملک کے تمام وسائل معیشت پر قابض ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کسی فرد یا طبقے کو وسائل معیشت پر حق ملکیت نہیں دیتا۔

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلعم عشر کی رقم، زرِ صلح اور جزیہ کا روپیہ تمام مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے تھے چنانچہ دولت کسی خاص ہاتھ میں مرکوز نہیں ہونے پاتی تھی۔ بیت المال میں جو رقم جمع ہوتی تھی وہ عام مسلمانوں کی مصالح کی تکمیل اور رفع حاجات پر خرچ ہوتی تھی اس آیت پر غور فرمایئے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔

(ترجمہ۔ اور جان لو کہ جو تم فتح پا کر حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

(پارہ ۱۰ سورت ۸ آیت ۴۱)

مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہونے سے مراد یہی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ خرچ ہو یعنی بیت المال میں داخل مسلمانوں کی ضروریاتِ عامہ پر خرچ ہو اور باقی سپاہیوں وغیرہ میں تقسیم ہو یا ان کی تنخواہوں اور سامان کے کام آئے پھر ان ضروریاتِ عامہ کی تفصیل بیان کر دی یعنی رسول اور قریبی اور یتیم اور مساکین اور مسافر۔ رسول اللہ صلعم بقدر ضرورت لے کر باقی سب مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ کر دیتے تھے۔ اب یہ کہ آپ کس قدر لیتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب آپ ملک عرب کے بادشاہ تھے تو آپ کے گھر کا سامان ایک کھجور کی چٹائی اور ایک پانی کی ٹھلیا تھی اور بیبیوں نے جب کچھ اپنی آسائش کے لیے مال مانگا تو حکم ہوا کہ اگر دنیا کا مال چاہتی ہو تو آؤ تمہیں رخصت کر دوں۔

ذوی القربٰی سے مراد نبی کریم صلعم کے قریبی ہی لیے گئے ہیں، مگر اس سے مراد یہ بھی نہیں کہ ان کے خوشحال افراد کو دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا وہ حق صرف اس قدر ہے کہ ان میں سے جو غریب ہیں اُن کو دیا جائے۔ قرآن میں ان کے خاص ذکر کی وجہ یہ ہے کہ بیت المال میں جو صدقات آتے تھے وہ ان پر حرام کیے گئے تھے اور صرف اس مال سے ان کو دینا جائز تھا۔

وسائلِ معیشت میں اراضی کو اساسی حیثیت حاصل ہے اور اگر اس کو چند افراد یا طبقات میں تقسیم کر دیا جائے تو زمینداریاں پیدا ہوتی ہیں اسلام زمین کو کسی فرد یا گروہ

کی ملکیت نہیں بناتا بلکہ اس کی آمدنی کو بیت المال میں جمع کر کے مصالح عامہ پر خرچ کرتا ہے۔

جب عراق اور شام فتح ہوئے تو حضرت بلالؓ، حضرت زبیرؓ اور دوسرے صحابہ نے مطالبہ کیا کہ انہیں عراق کی زمین کا مالک بنا دیا جائے۔ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ وغیرہ نے مخالفت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمین کی ملکیت پر راضی نہ تھے اور فرماتے تھے:

"یہ عامۃ المسلمین کی دولت ہے، میں کسی ایک فرد یا کسی خاص طبقہ کو ہرگز اس کا مالک نہیں بناؤں گا۔"

اس بات پر خوب ردوکد ہوئی۔ جو لوگ تقسیم کے حق میں تھے وہ کہتے تھے کہ عمرؓ ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ جس زمین کو ہم نے تلواروں کے ذریعے فتح کیا ہے عمرؓ ان کو ایسے لوگوں کے لیے روکتے ہیں جو جنگ میں شریک نہیں تھے۔

جب معاملہ طول پکڑ گیا تو حضرت عمرؓ نے اس کو مجلسِ شوریٰ میں پیش کر دیا جس میں پانچ اوس اور پانچ خزرج کے سرکردہ افراد شامل تھے۔ آپ نے مجلسِ مشاورت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں بھی آپ ہی جیسا ایک فرد ہوں۔ کچھ لوگوں نے میری موافقت کی ہے اور کچھ نے مخالفت۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہشات کے مطابق چلیں۔ آپ کی پاس اللہ کی کتاب ہے جو حق کو واضح کرتی ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنی رائے کی تائید میں سورۃ الحشر کی یہ آیت پیش کی:

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ لِکَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ

(ترجمہ) جو اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مالِ غنیمت دلایا اور وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں (کے لیے ہے) تاکہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر نہ پھرتا رہے۔ (پارہ ۲۸ سورت ۵۹ آیت ۷)

آیت کا مفہوم واضح تھا، اس کے بعد اختلاف کی گنجائش نہ رہی اور سب نے حضرت عمرؓ کی بات مان لی۔ ان زمینوں کا خراج بڑی مقدار میں مدینے آیا اور مسلمانوں پر تقسیم کر دیا گیا۔ اگر حضرت عمرؓ زمین تقسیم کر دیتے تو دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی اور عامۃ المسلمین منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اس بارے میں سید امین الحق صاحب لکھتے ہیں:

"اسلام دولت مندوں کی ثروت کو جائز قرار دیتا ہے اور کسی دولت مند پر ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرتا۔ مگر اس کے ساتھ نفس معیشت میں بنی نوع انسان کے ہر فرد کو دولت کے ساتھ مساوی اور برابر حق دیتا ہے اور اسلام کسی انسانی فرد کا نفس معیشت سے محروم رکھنا برداشت نہیں کرتا۔۔۔۔۔ حضرت عمرؓ نے سواد کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والوں کے مقابلہ پر سورت الحشر کی آیات سے سواد کی تقسیم نہ کرنے کے لیے احتجاج کیا تھا اور حضرت عمرؓ کے اس احتجاج کرنے پر تمام مخالفین اور موافقین حضرات صحابہ کے اتفاق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف معیشت کے حق کو نسل انسانی کے تمام افراد کے لیے مساوی طور پر برقرار رکھتا ہے اور کسی کو بھی حقِ معیشت کی مساوات میں دخل انداز ہونے کا حق نہیں دیتا ورنہ جن حضرات نے سوادِ عراق و شام کی اراضی کو سرفروشانہ قربانیوں سے بزورِ شمشیر حاصل کیا تھا۔ ان حضرات کے علاوہ عراق اور شام کی اراضی سے دوسرے ایسے حضرات آنے والوں کو، جو مذکورہ فتوحات میں شریک نہیں تھے معیشت حاصل کرنے کا حق ہرگز نہ دیا جاتا۔ اور مجاہدین میں اس لیے تقسیم نہیں کیا گیا کہ ان میں تمام مسلمانوں کا حق تھا سلیمان بن یسار فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے سواد کا علاقہ ان لوگوں کے لیے محفوظ رکھا جو مردوں کے صلب اور عورتوں کے رحم میں ہیں اور اہلِ عراق کو ذمی قرار دیا۔ (فتوح البلدان باب فتوح السواد ص ۳۸۲)

غرض یہ ہے کہ اسلامی امت کا یہ فرض قرار دیا گیا کہ مصلحت عامہ اور اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ حکمت میں، اگرچہ رزق کے اعتبار سے تفاضل و تفاوت درجات پائے جاتے ہیں لیکن اس تکوینی تنوع کے باوجود بھی نسلِ انسانی کا کوئی فرد معیشت کے حق سے محروم نہ رہنے دیا جائے اور اہل ثروت کی دولت میں اخذ کرنے

پر مزید التفات اور توجہ نہ کی جائے۔"

{ (سید امین الحق: اسلام کا معاشی نظام اور معاشی نظریات صفحات ۲۴۲، ۲۴۳) }

حضرت بلالؓ کی استدعا پر حضرت رسالت مآب نے زمین کا اچھا خاصا رقبہ آپ کو عنایت فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت بلالؓ کو بلا کر فرمایا:

"جو رقبہ حضورؐ نے آپ کو مرحمت فرمایا تھا اس کو آپ پورا سنبھال نہیں سکتے۔ جس قدر سنبھال سکتے ہو پاس رکھو، باقی واپس کردو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ کے انکار کے باوجود زمین کا غیر آباد حصہ ان سے لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔"

حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے اپنی خلافت کا آغاز جاگیروں سے متعلق دستاویزیں پھاڑنے اور جاری وظیفے بند کرنے سے کیا جو بنو امیہ کو ناجائز دیئے جاتے تھے۔ آپ نے منادی سے کہا کہ نماز کا اعلان کرو۔ پھر مسجد میں گئے۔ لوگ جمع تھے ان سے کہنے لگے:

"جو کچھ حرام مال جمع تھا سب نکال رہا ہوں اور بیت المال میں داخل کر رہا ہوں۔"

آپ نے ساری دستاویزیں جلا دیں اور جاگیریں واپس کر دیں۔ اس اصول پسندی پر بنو امیہ آپ سے ناراض ہو گئے اور وہ اکٹھے ہو کر آئے اور کہا:

"آپ نے بیت المال کو تو زندہ کر دیا اور اپنے بھائیوں کو بھوکا مار دیا۔ آپ رد مظالم کیوں کرتے ہیں؟ یہ ظلم تو پچھلوں نے کیے تھے۔ آپ سے کیا واسطہ۔ آپ جو چاہے کیجئے مگر ہمارے وظائف کے معاملے میں دخل نہ دیجئے۔"

حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے کہا:

"مگر میں اسے پسند نہیں کرتا، بخدا زمین پر ایک ظلم بھی نہ چھوڑوں گا خواہ ہر ستم کے بدلے میرا ایک عضو کاٹ دیا جائے۔ حتیٰ کہ اس طرح میری جان چلی جائے۔"

واقعی حضرت عبداللہ بن عبدالعزیز نے کوئی ظلم نہ چھوڑا۔ یحیٰی بن سعید کا کہنا ہے:

"مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ نے صدقات وصول کرنے پر لگایا تو مجھے وہاں کوئی ایسا شخص نہ مل سکا جسے وہ صدقات دے سکوں کیونکہ عمر بن عبدالعزیز نے لوگوں کو مالدار کر دیا تھا۔ لہٰذا میں نے اس خیرات کے مال سے کچھ غلام خرید ے اور انہیں آزاد کر دیا"۔ ۔ ۔

(ذ) زکوٰۃ

الزکوٰۃ۔ زکا سے مشتق ہے اور کھیتی کے بارآور ہونے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اسی سے زکوٰۃ ہے اور یہ وہ مال ہے جو فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس سے برکت ہوتی ہے اور مال بڑھتا ہے یا اس وجہ سے کہ اس سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔

فریضۂ زکوٰۃ کی بجا آوری سے دوگونہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو قوم کے غریب، مسکین، نادار لوگ فکر معاش سے نجات پاتے ہیں، دوسرے دولت کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ دولت کی تقسیم کا یہ بہت اعلیٰ انتظام ہے۔ سوشلسٹ محض دھوکا دیتے ہیں۔ اُن کے پاس غریب عوام کی حالت سدھارنے کا کوئی نظام نہیں۔ اسی طرح یورپ آج جس مشکل سے دوچار ہے، وہ یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہوجاتی ہے۔

اسلام نے یورپ کی افراط اور سوشلسٹ ملکوں کی تفریط کا علاج تین طریقوں سے کیا ہے۔ زکوٰۃ کو متمول لوگوں کی دولت میں سے ہر سال چالیسواں حصہ نکل کر غرباء میں تقسیم ہوتا ہے۔ تقسیم وراثت اور ممانعت سود۔

(ر) اسلام کا قانونِ وراثت

اسلام کا قانونِ وراثت ہر زمانے کے معاشی مسائل کا واحد حل اور آخری حل ہے معاشی مسائل یا تو عدم مساوات سے پیدا ہوتے ہیں یا ارتکازِ دولت سے۔ قانونِ وراثت بیک وقت دونوں خرابیوں کا سدباب کرتا ہے۔ وہ یوں کہ ایک طرف ہر حق دار کو حق پہنچتا ہے، دوسری طرف تقسیم ترکہ کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے، جس کی وجہ سے دولت

برابر تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے اور کسی خاص فرد کے ہاتھ جمع نہیں ہونے پاتی۔

اسلام کا قانونِ وراثت حقوقِ انسانی کی مساوات کا چارٹر ہے۔ یہ ایک ایسا شاہکار ہے، جس کی نظیر نہیں۔ اگر دنیا کے ملکوں میں اس اصول کو نافذ کر دیا جائے تو سب معاشی ناہمواریاں اور ناانصافیاں دُور ہو جائیں اور افراد و طبقات کا تزاحم ختم ہو جائے۔ غور کی جا ہے کہ اُمّی محض نے آج سے چودہ سو برس پہلے اُن معاشی مشکلات کا حل بتا دیا جن سے آج انسان دوچار ہے۔ آخر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسانی دکھوں کا علاج اسلامی تعلیم میں ہے اور کہیں نہیں ؎

ہرچہ دانا کُند، کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

اولاد میں ایک مشاورت ہے، وہ سب حصہ دار ہوتے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ بیٹوں کو ساری جائیداد دی جائے، اور نہ ہی ساری اولاد کو محروم کر کے ایک کے سپرد کُل جائیداد کر دی جائے جیسا کہ بعض ممالک میں سب سے بڑا بیٹا جائیداد کا مالک ہوتا ہے اور باقی سب اولاد محروم رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر میاں، بیوی کی جائداد کا وارث ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ بیوی میاں کی جائداد میں حصہ نہ لے۔ اسی طرح ماں باپ کے حقوق ہیں۔ تفصیلِ حقوق کے لیے مطالعہ فرمایئے۔ سورۃ النساء کی آیات سات سے چودہ تک۔

اسلام کے عادلانہ نظامِ معیشت پر ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"قرآن و سنت کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کی عملی زندگی کے مطالعہ کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا اذعان ہو گیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشہ میں دولت اور وسائل دولت کے احتکار و اکتناز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام نے سوسائٹی کی نوعیت کا جو نقشہ بنایا ہے اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بنیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو جائے گا جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑپتی ہوں گے نہ مفلس و محتاج طبقے۔ ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائے گی۔ بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی و کسب کے بغیر کوئی مومن زندہ ہی نہیں

رہ سکتا۔ لیکن جو فرد جتنا کم سے کم اُتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور ہوگا اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی اُتنی ہی زیادہ جماعت بحیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی جائے گی۔ قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے لیکن صرف اپنے ہی لیے نہیں کمائیں گے بلکہ تمام افراد قوم کے لیے کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیغام ہو جائے جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔" (ابوالکلام آزاد۔ ترجمان القرآن جلد دوم صفحات: ۱۲۲-۱۲۱)

بلند پایہ کتابیں

۱۔ علمی اردو لغت (جامع) زندہ اردو زبان کی ایک جامع لغت

جس میں اردو ادب کے فضلا، عام قاری اور طالب علموں کی جملہ ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو ادب کے ماہرین نے (ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، میرزا ادیب، پروفیسر محمد شفیق، مولانا ماہر القادری کراچی، روزنامہ ہائے نوائے وقت، مشرق، جنگ کراچی، ماہنامہ کتاب لاہور) نے بہترین آراء کا اظہار کیا ہے۔ (طبع دوم)

صفحات ۱۶۳۶، کتابت عمدہ، آفسٹ چھپائی، مضبوط اور خوبصورت جلد، قیمت ۱۲۰ روپے

۲۔ علمی اردو لغت (متوسط)

از وارث سرہندی ایم۔ اے: یہ درمیانی لغات سکولوں کالجوں کے طالب علموں اور عام شائقین کے لیے کم قیمت والی لکھی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ نصابی کتابوں کے تمام الفاظ اور عام اخباری الفاظ اس میں مل جائیں۔ معانی میں اختصار کر کے ضخامت کم کر دی ہے۔ صرف ضرورت کے الفاظ شامل کیے گئے ہیں۔

صفحات بارہ سو $\frac{18 \times 23}{8}$ ستمبر ۱۹۷۹ء تک مارکیٹ میں آجائے گی انشاءاللہ تعالیٰ قیمت اندازاً پچاس روپے

۳۔ کالم نویسی

از پروفیسر شفیق جالندھری، شعبہ صحافت، پنجاب یونیورسٹی۔ صحافت کے فن کے متعلق عمدہ پیش کش، جو نہ صرف طلبہ ایم۔ اے صحافت بلکہ نوجوان صحافیوں کی راہنمائی بھی کرتی ہے۔ اکثر اخبارات نے اس کے متعلق بڑے بلند آراء کا اظہار کیا ہے۔ قیمت: دس روپے۔

۴۔ اردو کے دس عظیم شاعر

از پروفیسر محمد اقبال جاوید ایم۔ اے، صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ۔ یہ اردو ادب کے مشہور مصنف و ادیب کے مطالعہ و فکر کا نچوڑ ہے جو درج ذیل اردو کے دس شعراء کے فن و فکر کا ایک جامع تنقیدی جائزہ ہے جن پر نیچے دیئے گئے عنوانات کے تحت سیر حاصل بحث کی گئی ہے: ولی۔ میر تقی میر، میر درد، مصحفی، آتش، غالب، حالی، حسرت، اقبال، اصغر۔ عنوانات: (۱) شعر و سخن پر عمومی بحث (۲) شاعر کے فکر کا ہر پہلو (۳) تبرکات کے عنوان سے عظیم نقادوں کے نایاب مضامین اور آراء (۴) انتخاب کلام، خصوصیات کے اعتبار سے (۵) اشارات (۶) ماخذ، تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک مفید فہرست (۷) تنقیدی بحث، زبان کے بانکپن کے ساتھ۔ قیمت ۳۳/- روپے۔

۵۔ مباحث از ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب: لسانی و تحقیقی مضامین (اردو ادب اور شاعری کے متعلق بہترین تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ اصولی بحثیں تنقیدی تجربے اور احسانات شامل ہیں) صفحات ۴۵۶۔ کاغذ سفید، پرنٹنگ آفسٹ، قیمت ۲۰/۰ روپے

۶۔ سرسید احمد خاں اور اُن کے رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ؛ از سید محمد عبداللہ صاحب ڈاکٹر صاحب موصوف کی مشہور کتاب کا تیسرا ایڈیشن (۱۹۶۹) صفحات ۲۰۸۔ کاغذ سفید، چھپائی آفسٹ، قیمت ۱۸/۰ روپے

۷۔ مقاصدِ اقبال از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب۔ طبع دوم۔ مندرجہ ذیل موضوعات شامل ہیں: (۱) بازیافت کا ایک عمل (۲) ملی وجود کے چند دشمن (۳)، خارجی عنصری حملہ مغربیت (۴) اسلامی وحدت کے تین داخلی دشمن، ضعف، ذلت، علت کا علاج (۶) فکرِ اقبال (اقبال اور رومی، اقبال اور روایت۔ اقبال دانتے اور ابن عربی، اقبال اور فخر رازی) فکرِ اقبال کے مراحل ارتقاء۔ اقبال ارباب خرد کے نقش قدم پر (۷) اقبال اور سائنس۔ کاغذ سفید، چھپائی آفسٹ، صفحات۔ قیمت: ۲۱/۰ روپے

۸۔ مخزنِ نعتِ رسولؐ مرتبہ: پروفیسر جاوید اقبال گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ۔ قدیم اور جدید شعراء کی بلند پایہ نعتیں (عربی، فارسی اور اردو) مقدمہ میں نعت گوئی سے متعلق نہایت مفید معلومات۔ نعتوں کے اشعار کے متعلق حوالہ جات اور تشریحات کتابت، چھپائی اعلیٰ، صفحات ۲۸۸۔ ہدیہ ۱۲/۰ روپے۔

۹۔ علمی انگلش اردو ڈکشنری از وارث سرہندی ایم۔ اے۔ اس انگلش اردو ڈکشنری کو حتی الامکان ایسی جامع کتاب بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ایک جلد میں بڑے درجے کے طلبہ تک کے لیے عام الفاظ کے اردو معانی مختلف مضامین کی اصطلاحات، ضروریات کے محاورات کے اردو معانی، قانونی الفاظ کے اردو معانی وغیرہ وغیرہ۔ وارث صاحب کا نام لغت کے کام میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ ڈکشنری الفاظ کے صحیح معنی بتائے گی۔ انشاء اللہ آپ کے ہاتھ میں جلد پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

علمی کتاب خانہ

کبیر سٹریٹ • اردو بازار • لاہور